قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان حصہ اول و دوم۔ مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات بالترتیب ۳۰ مجلد و ۱۰۲ غیر مجلد قیمت ہر دو حصہ عام پتہ: (۱) مسلمانوں کا سوشلسٹ سینٹر ڈی ۱۹۸۔ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۳ (۲) انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۰۰۶، کلاں محل، دہلی ۶۔

پہلا کتابچہ لائق مرتب اور ظفر امام صاحب کے دو فکر انگیز مقالوں اور دوسرا سولہ اصحاب علم و قلم کی ان تقریروں پر مشتمل ہے، جو نومبر ۶۸ء میں دہلی کے ایک سیمینار میں کی گئی تھیں، پہلے میں ہندوستان کے قومی کلچر کے بعض پہلوؤں کی وضاحت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے رول کا ذکر ہے، اور دوسرے میں اسی موضوع کے بارہ میں مولانا ابو الکلام مرحوم کے نقطۂ نظر کی مقررین نے توضیح کی ہے، دونوں کتابچوں میں مجموعی حیثیت سے معتدل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، تاہم بعض باتیں کھٹکتی ہیں، دوسرے کتابچہ میں فاضل مرتب نے موجودہ مسلم قیادت اور جماعتوں کا دلچسپ اور مبصرانہ تجزیہ کیا ہے لیکن مضمون کے آخر میں غیر معتدل باتیں بھی آگئی ہیں۔

صحرا میں اذان۔ از جناب گوپال متل صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، خوبصورت سرورق، صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ر پتہ: مکتبہ تحریک ۵۰ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶۔

جناب گوپال متل اڈیٹر تحریک اردو کے مشہور صاحب قلم اور مشاق شاعر ہیں، یہ انکا نیا مجموعۂ کلام ہے، کمیونزم دشمنی انکا خاص مسلک ہے، اس مجموعہ میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے، موجودہ حالات سے وہ بد دل ہیں اور انھوں نے صحرا میں اذان دینے کی کوشش کی ہے، انکو اصل مناسبت غزل سے ہے، اسلیے اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، اور انھوں نے غزل کے روایتی اسلوب و انداز کو اپنے مخصوص رنگ اور نئے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اس مجموعہ میں آزاد اور پابند نظمیں بھی ہیں، اور ان سے بھی شاعر کی فن پر قدرت، جذبات و احساسات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، مجموعی حیثیت سے متل صاحب کی شاعری کیفیت، جدت ادا، جوش بیان، طنز و ظرافت اور فکر و خیال کی رعنائی و تازگی سے معمور ہے، اور اس مجموعہ کی ظاہری صورت بھی نہایت پرکشش اور جاذب نظر ہے۔ "ض"

جلد ۱۰۶ ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

جمال عبدالناصر کی موت دنیائے عرب کا بہت بڑا حادثہ ہے، مدتوں کے بعد عربوں میں اتنا بڑا لیڈر پیدا ہوا تھا، ان کی پوری زندگی قوم و وطن کی راہ میں ایک جہد مسلسل تھی، اس راہ میں جان تک دیدی، انھوں نے عربوں میں آزادی کی روح پھونکی، مصر کو شخصی بادشاہت سے نجات دلائی، سامراجی طاقتوں سے ٹکر لی، برطانوی اقتدار سے سرزمین مصر کو آزاد کرایا، نہر سویز کے قومیانے کے انتقام میں فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کے متحدہ حملہ کو زک شکست دی، اسوان بند تعمیر کرایا، ان کے علاوہ اور بہت سے تعمیری کام کئے، ان کارناموں نے اُن کو دنیا کے بڑے لیڈروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، وہ اپنی قوم میں اس قدر مقبول و محبوب تھے کہ اگر اُن کی جگہ کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو ۶۷ء کی شکست کے بعد اس کا زوال یقینی تھا، لیکن اس کے بعد بھی اُن کی مقبولیت میں فرق نہ آیا، ان سے بعض سیاسی اور مذہبی غلطیاں بھی ہوئیں، جن سے عرب تحاد اور خود ان کے ملک اور ان کی شہرت کو نقصان پہنچا، لیکن ان کی مذہبی غلطیاں، مذہب کی مخالفت یا اُس سے آزادی کے بجائے اس دور کی لادینی سیاست کا نتیجہ تھیں، جس سے کوئی اسلامی ملک بھی محفوظ نہیں، خصوصاً جن کی سیاست میں غیر مسلم بھی دخیل ہیں، مگر ان غلطیوں کے مقابلہ میں اُن کے کارنامے زیادہ ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے اچھے اعمال کے طفیل میں اُن کی مغفرت اور ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے، ان کی زیر تعمیر مسجد میں اُن کی تدفین بھی اُن کے حسن خاتمہ کے لئے فال نیک ہے، اُن کی موت سے عرب دنیا ایک ایسے لیڈر سے محروم ہوگئی، جس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی،

……

اس وقت چند ملکوں کو چھوڑ کر انڈونیشیا سے لیکر افریقہ تک پوری اسلامی دنیا آپس کے اختلاف و نزاع کا شکار ہے، آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، اور سب سے زیادہ عرب ملک اس میں مبتلا ہیں، جو تحاد اسلامی

اور وحدت ملی کے اولین حامل تھے، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چند لاکھ یہودیوں نے عربوں کی سرزمین پر قبضہ کر لیا، اور کروڑوں عرب اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکے، یہ صحیح ہے کہ یہودیوں کی پشت پر امریکہ کی قوت ہے، لیکن وہ کب تک اُن کی پشت پناہی کر سکتا ہے، اگر عرب حکومتوں میں اتحاد ہوتا تو یہودیوں کو فلسطین میں پناہ نہ ملتی، مگر اس سے بھی اُن کو سبق حاصل نہیں ہوتا، اُن کے اختلافات کا سب سے عبرت انگیز نمونہ اہل اردن اور فدائیوں کی باد رکشی ہے، جس کا سلسلہ مصالحت کے بعد بھی ختم نہیں ہوا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، عربوں میں صرف ناصر کی شخصیت ایسی تھی جو اس قسم کی گتھیوں کو سلجھا سکتی تھی، ان کے بعد کوئی شخصیت نظر نہیں آتی، اس لئے اُن کی موت کا اثر پورے مشرق وسطیٰ کی سیاست پر پڑے گا، معلوم نہیں وہ آیندہ کیا رُخ اختیار کرتی ہے، اللہ تعالیٰ مغربی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں سے انکو محفوظ رکھے،

……

ہندوستان کے سیکولر نظام حکومت کی خوبیاں اپنی جگہ مسلم ہیں، مگر کچھ مسلمانوں نے سیکولرزم کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ تصوف و صوفیہ کو بھی اُس کے حلقہ میں لے لیا ہے، اور اس کی کوشش مستقل جاری ہے کہ ہندوستان کے صوفیہ اور اُن کی تعلیمات کو سیکولر ثابت کیا جائے، یعنی اُن کی نگاہ میں کفر و اسلام برابر تھے، اسلامی عقائد و عبادات کو وہ زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، وہ صرف انسانی محبت کے داعی و مبلغ تھے، اس سے زیادہ صریح بہتان ان نفوسِ قدسیہ پر نہیں ہو سکتا، ان متصوفین کا ذکر نہیں، جن کو حقیقۃً تصوف سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور وہ صرف صوفیوں کے لباس میں ہُو حق کے نعرے لگاتے تھے، اکابر صوفیہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کا زندہ پیکر، بلکہ ان کے سب سے بڑے معلم و مبلغ تھے، انہی کے بدولت ہندوستان میں اسلام پھیلا جس کا اعتراف غیر مسلم مورخین تک کو ہے، اُن کا قدم کتاب و سنت کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا تھا، وہ نہ صرف اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال بلکہ سنن و نوافل و مستحبات کی پابندی تک پر زور دیتے تھے، اُن کے اسلام کا معیار فقہی

معیار سے بہت اونچا تھا، جس پر اُن کی تصانیف اور ملفوظات شاہد ہیں، اور جن سے ہر صاحب علم واقف

....

البتہ ان میں فقیہانہ تشدد کے بجائے انسانی محبت میں وسعت و رواداری تھی، ان کا دروازہ مسلم و غیر مسلم سب کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کھلا ہوا تھا، وہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی محبت سے پیش آتے تھے، جو ایک مبلغ کے لئے ضروری ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کی تالیف قلب کیلئے ان کے ساتھ بڑی نرمی اور رواداری برتتے تھے، جو غیر مسلم وفود آپ کے پاس آتے تھے، اُن کی میزبانی فرماتے اُن کو مسجد نبوی میں ٹھہراتے اور اس میں عبادت تک کرنے کی اجازت دیدیتے، حدیثوں میں بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم ہر انسان کے ساتھ رحم و کرم لطف و مدارات اور احسان و سلوک کی تعلیم ہے، صوفیہ کا عمل بھی اسی تھا، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اُن کی نگاہ میں کفر و اسلام برابر تھے اگر ایسا ہوتا تو وہ اسلام کی تبلیغ کیوں کرتے

....

دوسرے صوفیہ اتباعِ شریعت اور اس کے ظاہری احکام کی پابندی کے ساتھ اُس کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں یعنی اخلاص و احسان وغیرہ پر زیادہ زور دیتے تھے، جو دین کا مغز ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کو صوفیہ یا ان علماء نے زندہ رکھا جو صوفی بھی تھے، کامل اسلام اس کے ظاہری قوانین اور اس کی روح دونوں پر عمل کا نام ہے، اکابر صوفیہ کی تصانیف میں کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے، جو شریعت کے خلاف یا ان معنوں میں سیکولر ہو جن معنوں میں سیکولر مسلمان اس کو پیش کرتے ہیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد سے نام نہاد مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو غیر مسلموں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے نہ صرف تصوف و صوفیہ بلکہ اسلام کو غلط رنگ میں پیش کر رہا ہے، اور اس کی قیادت ان اداروں کے ذمہ دار کر رہے ہیں جن کے ساتھ "اسلامیت" کا دم چھلا لگا ہوا ہے، لیکن دین سے واقف مسلمان ان کی ہفوات سے زیادہ وقعت نہیں دیتے،

مقالات

ادبی سرقات
کلامِ غالب کی روشنی میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

غالب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جھنجھلا اٹھنے والوں میں مرزا واجد حسین یگانہ (المتوفی ۱۹۵۹ء) کا نام بہت نمایاں ہے، وہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۰۳ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول گلزار باغ پٹنہ سے انٹرنس پاس ہوئے، ان کا خود بیان ہے کہ استاذ المکرم فخر المتاخرین جناب خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد کی آغوش میں تربیت پائی، شروع میں یاس تخلص کرتے تھے، اسلئے ایک عرصہ تک یاس عظیم آبادی کے نام سے چھپتے رہے، ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تو وہیں منتقل ہوگئے، یہاں مرزا انیس کے پوتے حضرت رشید رضا صاحب سے مشورۂ سخن کرنے لگے، اور اپنے کو یاس عظیم آبادی ثم لکھنوی کہنے لگے، یاس سے یگانہ ہوگئے، پھر یگانہ کے آگے علیہ السلام بڑھا دیا، پھر یگانہ چنگیزی ہوگئے، اپنی کتاب "غالب شکن" کو چنگیز خان کے نام سے ان الفاظ میں معنون کیا:-

بجناب ہیبت مآب، دیوتائے جلال و عتاب پیغمبر قہر و عذاب دشمن تہذیب پرفن

حق شناس، باطل شکن مردمیدان، جگیر دبزن شہنشاہ بنی آدم سرتاج سکندر و جم حضرت
چنگیز خان اعظم قہر اللہ

اور اپنی چنگیزیت میں خوش تھے کہ "وہ مار گھونسوں کے داد وصول لیتے ہیں"۔ (غالب شکن ص ۴)
لکھنؤ کے شعراء، مثلاً صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ اور محشرؔ وغیرہ سے ان کی بڑی معرکہ آرائی ہوئی،
انھوں نے ان کا بائیکاٹ کیا، تو اس کو وہ اپنی فتح و کامرانی سمجھتے رہے، جیسا کہ لکھتے ہیں:

تمام شعرائے لکھنؤ عاجز آکر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہوئے، سامنے آنا منہ دکھانا چھوڑ دیا،
ذرہ غور تو کیجئے، اس سے بڑھ کر داد اور کیا ہوگی، بائیکاٹ کا فلسفہ تو یہی ہے کہ روندا ہوا
دشمن جب ہر طرف سے عاجز آجاتا ہے، کوئی کاٹ نہیں کر سکتا، تو بائیکاٹ کے حربہ پر اتر آتا ہے،

اپنی اس خود پرستی میں خوش تھے کہ "انھوں نے غوغائیان لکھنؤ کے منہ کیل دیے بولتی
ماردی"۔ (ص ۱۳) لیکن اس دعوئی کے باوجود ان کو لکھنؤ کے غوغائیوں سے پریشانیاں
بھی اٹھانی پڑیں، وہ خود ہی لکھتے ہیں:۔

عزت کو میں نے لکھنؤ میں...... قربان کر ڈالا، کیا کیا گالیاں کھائیں، مغلظات،
کیا کیا ہجویں سنیں، کیا کیا مادی نقصان اٹھائے، لگی لگائی روزی، اودھ اخبار کی
ملازمت چھوڑی.... آجکل اپنے وطن میں ساٹھ روپئے کی ملازمت ایک صاحب
اہل و عیال کے لیے بڑی قیمتی چیز ہے، ایسی ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کر دینا
پڑا، اس زمانہ میں (کہ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں، کیونکہ شاعری ایک سند سمجھی جاتی ہے،
نکمے پن کی شاعری گویا عقل و خرد سے بالکل بیگانہ ہے، دنیا کا کوئی کام کر ہی نہیں
سکتا) کوئی آسان کام نہیں"۔ (ص ۱۱-۱۰)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان جھگڑوں میں جن کو وہ آرٹ کے مرتبہ کمال تک پہنچانے کی

کوشش تصور کرتے رہے، ان کو پورب پچھم اتر دکھن کے کٹے کنکوے کی طرح تیاتے پھرنا پڑا،
یہاں تک کہ لاتور دکن کے رجسٹرار ہوگئے۔
لیکن معلوم نہیں کس اصول اور ضمیر پرستی کی بنا پر اپنے تخلص کے ساتھ علیہ السلام لکھنا
شروع کیا، اور دوسروں سے اپنے کو A living mind of The east کہلوایا،
ان کے کلام کے مجموعہ آیات وجدانی کے شروع میں مرزا مراد بیگ شیرازی نے
"محاضرات" لکھا ہے، اس میں غالباً یگانہ ہی نے ان سے یہ لکھوایا،

"بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان نے تین افراد کامل پیش کیے ہیں، جنکے
نام ایشیا کے سخنوران علی الاطلاق کی فہرست میں آب زر سے لکھے جائیں گے،......
اول دو شخصوں سے میری مراد مولانا شاید اکبرآبادی؟ اور حضرت مرزا یگانہ لکھنوی
المعروف بہ مرزا یگانہ یاس عظیم آبادی سے ہے، اور تیسری شخصیت سر رابندر ناتھ ٹیگور
کی ہے، جو ذی کمال ہونے کے علاوہ مادی زندگی اور شہرت عامہ کے اعتبار سے خلاف
معمول کامیاب ثابت ہوئے"۔ (آیات وجدانی ص ۴۴)

یہ تحریر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی، لیکن مرزا یگانہ کا جو انجام ان کی وفات سے پہلے ہوا،
وہ ناظرین بھولے نہ ہوں گے، وہ لاتور دکن سے پنشن پاکر لکھنؤ واپس آئے، تو انکی دریدہ دہنی
اور دشنام طرازی اتنی بڑھ گئی کہ وہ آخر میں شاتم رسولؐ بھی ہوگئے، غالباً ۱۹۵۲ء
کا سال تھا کہ ایک روز وہاں کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ باہر آئے،
تو کسی بہانے سے ان کو ایک گدھے پر بٹھا دیا، جوتوں کا ہار پہنایا، ان کے منہ پر سیاہی لگادی،
ان پر تھوکا، بازار میں گھمایا، اور "شاتم رسول پر لعنت ہو" کے نعرے لگائے، وہ ایک زمانہ میں
خوش تھے کہ انھوں نے غوغائیان لکھنؤ کے منہ کیل دیے، بولتی ماردی تھی، لیکن ان ہی غوغائیان

نے ان کی آخری زندگی میں ان کی بولتی مار دی" اور شاید اسی غم میں وہ ۱۹۵۹ء میں اس دنیا
سے چل بسے۔

ان کو یہ رسوائی ان کے خیال میں حق پرستی، فرض شناسی اور اصول پرستی کی خاطر اٹھانی
پڑی، ان کا دعویٰ رہا کہ ان کی تخریب میں تعمیر مضمر رہی، لیکن اس تخریب سے وہ خود پرست مغرور
ہو گئے، انھوں نے اپنے کو رابندر ناتھ ٹیگور کی صف میں تو لا کر ضرور کھڑا کر دیا تھا، مگر ان کو
احساس رہا کہ ان کی وہ قدر نہیں ہوئی جو رابندر ناتھ ٹیگور کی ہوتی رہی، اس لیے وہ اس
یاس میں باغی بنکر چنگیزیت پر اتر آئے، اور گو لوگ ان کو سڑی، سودائی، پریشان روزگار،
آوارۂ کوچہ و بازار سمجھتے رہے، لیکن وہ اپنے کو یکتائے زمانہ، شیر دل، بات کا دھنی، سخنور
بالا دست اور نشۂ کمال میں مست تصور کرتے رہے۔

اسی نشۂ کمال کی مستی میں غالب شکنی کا بیڑا اٹھایا، گو ان کے مداح مرزا مراد بیگ شیرازی
نے ان کی زندگی ہی میں لکھا تھا کہ مرزا صاحب خواجہ آتش کے فدائیوں میں اور غالب کے
بھی بڑے معتقد تھے، مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے حریف جو غالب کے مرتبہ سے ناآشنا
ہیں، جھوٹ موٹ غالب کی تعریفیں کیا کرتے ہیں، اور خواہ مخواہ خواجہ آتش کے منہ آیا کرتے
ہیں، تو پھر مقامی ضرورتوں نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ غالب کی حقیقت بھی واضح
کر دی جائے، یہیں سے غالب پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور یہیں سے مرزا یاس
کی خود پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ (آیات وجدانی ص ۱۳-۱۴)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس ادبی ریفارمر نے غالب پر نکتہ چینی لکھنؤ والوں کی فرعونیت
کی سرکوبی کی خاطر کی (ص ۲۱) مگر لکھنؤ والوں کی "حماقت اور فرعونیت" کے لیے غالب
کو تختۂ مشق بنانا کہاں تک درست تھا؟ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے بیس سال تک (غالب شکن ص ۱۵)

جو لب و لہجہ اختیار کیا، وہ کسی استاد فرزانہ، یکتائے زمانہ اور باکمال سخنور کے شایان شان
نہیں ہو سکتا۔

غالب کے خلاف ان کا پہلا مضمون غالباً ۱۹۱۵ء میں ہاپوڑ کے ایک رسالہ خیال
میں شائع ہوا جس میں انھوں نے آتش اور غالب کی ایک غزل کا موازنہ کر کے آتش کی برتری ثابت
کی ہے، یہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا، ۱۹۵۹-۶۰ء اور ۱۹۶۰-۶۱ء کے علی گڑھ میگزین
میں یگانہ کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ شائع ہوا تھا، یہ خود نوشت سوانح عمری ۱۹۱۴ء
میں لکھی گئی جو غالباً نامکمل رہی، اس پر انھوں نے غالب کے ایک شعر پر بہت ہی فاضلانہ
تنقید کر کے آخر میں آتش کو اونچا دکھایا ہے، اس تنقید کے کچھ حصے یہاں درج کرنے کے
لائق ہیں، اگر اس سے طوالت پیدا ہو جائے تو ناظرین اس کو دلچسپ اور پر مغز سمجھ کر
معاف کریں، غالب کا ایک شعر ہے:

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

یگانہ جو اس خود نوشتہ سوانح عمری کے وقت یاس تھے، لکھتے ہیں: جناب حسرت
موہانی اس شعر کی شرح بس اس قدر کرتے ہیں کہ یہ شعر ویسا ہی ہے جیسے غالب کا ایک
دوسرا شعر ہے:

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

جناب حسرت کے اس اختصار کی داد نہیں دی جا سکتی، غالباً جناب موصوف اس شعر
کے اصل معنی سمجھ نہ سکے اور نہ کوئی دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی، ایک دوسرا شعر نقل کر کے ٹال دیا
ہے، مگر حیرت تو یہ ہے کہ تشریح و توضیح کے لیے جو شعر نقل کیا گیا ہے اس کی نوعیت مضمون بالکل جداگانہ ہے، کیونکہ

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا۔

یہاں بہار یعنی معشوق کا خود عاشق ہونا دکھایا گیا ہے، اور گلہائے تازہ والے شعر میں معشوق کا عاشق ہونا نہیں بلکہ عاشق کے رنگ شکستہ کو دیکھ کر معشوق کا محو ناز ہونا ثابت ہوتا ہے، جناب حسرت موہانی نے جو شعر اس کی شرح میں نقل کیا ہے، وہ مقتضائے مقام کے خلاف ہے۔

حسرت پر یہ تنقید کر کے یاس یگانہ اس شعر کی جو شرح مولانا سید حیدر علی طباطبائی نے کی ہے، اس کو نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

طباطبائی: نظارہ اس کا یعنی معشوق کا موسم بہار ہے، اور اس کے نظارے سے میرا (عاشق کا) رنگ اڑ جاتا ہے، طلوع صبح بہار ہے، پھولوں کے کھلنے کا وقت ہے، غرض یہ کہ ہر وقت نظارہ منہ پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر وہ (معشوق) سرگرم ناز ہوگا، یعنی میرا رنگ اڑنا وہ صبح ہے جس میں گلہائے ناز شگفتہ ہوں گے۔

یاس: اگر اس شعر کے یہی معنی لیے جائیں تو بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر کی بندش بے ڈھنگی ہے، بات وہ کہنی چاہیے جو کہنے کے قابل ہو، اور اس طرح کہنا چاہیے جسے سن سکیں، ورنہ خاموشی بہتر ہے، اس شعر کا اور اس کی شرح کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ نظارۂ جمال سے عاشق کا رنگ اڑتے دیکھ کر معشوق کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے، اس بات کو صاف اور سلجھے ہوئے الفاظ میں بیان کرنا مشکل نہ تھا مگر غالب نے انداز بیان میں وہ سنجیدگی اختیار کی یعنی رنگ اڑنے کو صبح سے استعارہ کرنا اور صبح کونسی صبح بہار، اور بہار کیسی بہار نظارہ، اور پھر اس صبح بہار نظارہ کے لیے پھولوں کا کھلنا، پھول کونسے گلہائے ناز اور گلہائے ناز کے لیے شگفتن کی سی نامانوس لفظ (نامانوس باعتبار زبان اردو) جس سے سخن فہموں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ آیا یہ شعر کسی وہبی شاعر کا ہے یا اکتسابی شاعر کا، کیونکہ اس قسم کی بندشیں

وہبی شاعر کی شان سے بعید ہیں، اور غالب کا دیوان ان ہی پیچیدہ بندشوں سے بھرا پڑا ہے کہ ذہن کو بجائے انبساط اُلٹا تخفیف سی محسوس ہوتی ہے، سیدھی طرف سے ناک نہ پکڑ کر الٹی چال چلے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعر اکثر سیدھی راہ سے قطع نظر کر کے دوسری راہ اختیار کرتا ہے، اور اس کی یہ رفتار بعید دل پسند بھی ہوتی ہے، مگر اس رفتار خاص کے محل اور موقع ہوتے ہیں، ہر جگہ یہ روش پسندیدہ نہیں ہوتی ...... شاعر کو دیکھنا چاہیے کہ جو نئی راہ اختیار کی گئی ہے، وہ پسندیدہ اور مناسب مقام بھی ہے یا نہیں، غالب نے اس شعر میں اپنے مفہوم ذہنی کے ادا کرنے کے لیے جو استعارے پیدا کیے ہیں (یعنی رنگ اڑنے کے لیے صبح بہار نظارہ اور ناز کے لیے گل اور گل کے لیے شگفتن وغیرہ) وہ اس مقام خاص پر مذاق سلیم کے نزدیک بالکل مضحک ہیں، شاعر کو حسن کلام پر نظر رکھ کر سادگی و بلاغت کی مختلف صورتوں میں امتیاز کرنا چاہیے، رنگ شکستہ اور بہار نظارہ وغیرہ یہ سب ترکیبیں اپنی اپنی جگہ فصیح و خوش آئین ہیں، مگر اس شعر میں ان کی ترکیب باہمی سے جو معمے پیدا ہوتے ہیں، وہ ذہن کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں ...... غالب کے اس شعر میں یہی عیب ہے کہ یہ سب الفاظ اپنی اپنی جگہ فصیح ہیں، مگر ترکیب باہمی سے مصرعے غیر فصیح ہو گئے ہیں۔ مولانا نظم طباطبائی نے جو اس شعر کی شرح کی ہے بالکل الگ ہے، یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ شعر مہمل ہے، ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق ایک معنی گڑھ لیتا ہے ورنہ اختلاف کیوں ہوتا، شعر وہی ہے جس کا ایک رخ کم از کم سب کی نظروں میں یکساں دکھائی دے، ہاں اس ایک معنی کے علاوہ اور بھی نزاکتیں پائی جائیں تو سبحان اللہ! اور اگر ایک رخ بھی صاف نظر نہیں آتا تو شعر مہمل ہے، خواہ مخواہ بھی استقرار معنی میں اختلاف واقع ہوگا، یہی الفاظ (رنگ شکستہ، صبح بہار، بہار نظارہ) اور لوگوں کے یہاں

بھی ملیں گے، مگر یہاں جس طرح سے صرف ہوئے ہیں اہل نظر کے نزدیک مضحک ہیں، مذاق سلیم کے دربار میں یہ الفاظ بزبان حال فریاد کر رہے ہیں کہ ہماری ذات میں صانع نے وہ قوت بخشی تھی کہ اگر صحیح مصرف لیا جاتا تو ہم دلوں کو مسخر کر لیتے، مگر کیا کریں مجبور ہیں، شاعر نے ہمارا صحیح مصرف نہ لیا، ہم کو ایسی ذلیل اور پست جگہ پر بٹھا دیا ہے جہاں ہمارا احسن عیب نظر آتا ہے، زبان اردو الگ فریاد کرتی ہے کہ رنگ شکستہ کے بعد فارسی کا دوسرا ٹکڑا صبح بہار نظارہ اور پھر اسی کے بعد شگفتن کی اضافت گلہائے ناز وغیرہ نے مل کر میری مٹی خراب کر دی ہے، اس شعر کی شرحیں لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق کی ہیں۔

اس کے بعد یاس نے شوکت میرٹھی، واجد دکنی، فراغ دیوبندی وغیرہ کی شرحیں نقل اور ان کو رد کر کے آخر میں غالب کے شعر کے مقابلہ میں خواجہ آتش کا یہ شعر پیش کیا ہے:-

کیونکر وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں
انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا

اس پر یاس نے اپنی رائے لکھی ہے کہ زبان اردو کی نفاست کے ساتھ شعر میں اعلیٰ درجہ کی معرفت بھر دی ہے، حق یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا یہ شعر باعتبار معنی و لفظ عرش اعلیٰ کو پہنچا ہوا ہے، اور ایسا ہے کہ اہل حال کی صحبتوں میں پڑھا جائے تو لوگ وجد کرنے لگیں، غالب کے شعر میں معنوی خوبی اگر تسلیم بھی کر لیجائے تو الفاظ کا جامہ اتنا مضحک نظر آتا ہے کہ اردو زبان کے لیے باعث ننگ ہے، خواجہ صاحب چونکہ شاعر ہیں، اہل دل ہیں، اہل زبان ہیں، شاعری کا پورا پورا حق ادا کر دیا، خواجہ آتش کا شعر سو میں سو نمبر پانے کا مستحق ہے، اور غالب کا یہ شعر سو میں دس نمبر بھی مشکل سے پا سکتا ہے۔

یگانہ کی مذکورہ بالا رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن وہ غالب شکنی میں یہی طرز اختیار کرتے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بہت تو نہیں، مگر تھوڑا بہت کامیاب

ہو سکتے تھے، لیکن وہ اپنے مقتضائے طبیعت سے مجبور ہو گئے، اور سنجیدہ تحریر لکھنے کے بجائے غالب پر مضحک رباعیاں لکھنے لگے، جو انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام ترانہ (۱۹۳۶ء) اور پھر بعد میں "غالب شکن" میں شائع کیں، ان میں سے کچھ رباعیاں یہ ہیں:-

(۱)
دیوانوں کے یہ زور شور دیکھے نہ سنے — نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھ جاتے ہیں مگر — غالب سے چچا چور نہ دیکھے نہ سنے

(۲)
غالب کو میر سے بڑھانے والے — چودوں کو بانس پر چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے — دنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

(۳)
چنگیزی لہو ہے اپنی رگ رگ میں رچا — مجھ سے جو تنے تو منہ کی کھاؤ گے بچا
غالب کو چچا بنا کے چھوڑا میں نے — غالب میرے چچا، میں غالب کا چچا

(۴)
شہزادے بڑے فرنگیوں کے پالے — مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ — غالب کو وطن پرست کہنے والے

(۵)
غالب بھی ہے واللہ انوکھا صوفی — انگریز کے دربار کا بھوکا صوفی
پنشن جو ہوئی بند تو بھوک اور کھلی — ہے ایسا کوئی پیٹ کا بندہ صوفی

(۶)
اللہ ری ہوا و ہوس خلعت و زر — مرزا کا سر ہے اور انگریز کا در
ہاں کیوں نہ ہوں مورکھوں کے دیوتا غالب — ہے باؤلے گاؤں اونٹ بھی پرمیشر

بعض رباعیاں تو ایسی ہیں کہ سنجیدہ تحریروں کے ساتھ نقل نہیں کیجا سکتی ہیں، انھوں نے اپنی نثری تحریروں میں بھی غالب کو برا بھلا کہنے میں غیر سنجیدہ انداز اختیار کیا ہے، پروفیسر مسعود حسن رضوی کو ایک خط لکھا تو اس کو اپنی کتاب غالب شکن میں بھی منسلک کر دیا ہے، اس میں وہ کہتے ہیں:-

"غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال، وقت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اونٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیوں میں گم ہو جایا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سرا بھی ہے، پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے، مضمون چرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا، تصرف کی قدرت نہیں رکھتا، چوری کھل جاتی ہے، زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا، ٹھونس کے تک بندی کر لیتا ہے۔" (ص ۳)

"غالب کی لنگڑی شاعری کو بھکی ہوئی ذہنیتیں حسنِ کمال پر محمول کرنے لگی ہیں" ص ۳

"غالب کو اردو زبان کا واحد نمایندہ ٹھہرانا اس کے کلام کو سراسر الہامی اور ایڈیشن کہنا، حاشیہ نویسی و شرح نگاری کا دھندا اختیار کرنا مصنوعی پروپیگنڈا اور ادبی تجارت ہے۔" (ص ۵)

"غالب شاعروں میں شاعر، رئیسوں میں رئیس، درباریوں میں درباری، صوفیوں میں صوفی، رندوں میں رند، فلاسفروں میں فلاسفر، سپاہیوں میں سپاہی، وطن پرستوں میں وطن پرست، آخر یہ ہے کیا کہو اس۔" (ص ۱۶)

"غالب کا فلسفہ کیا بلا ہے، سوا اس کے کہ مرزا بیدل، مرزا صائب وغیرہ کے یہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اڑا لیتا ہے اور بس۔" (ص ۱۹)

ان جملوں کے ساتھ ان کے قلم سے غالب کے کلام کے لیے کچھ تعریفی کلمات بھی نکل گئے ہیں، جن کی خبر شاید ان کو نہ ہوئی ہو، وہ پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ "غالب کی شاعرانہ چوری ادبی بھٹئی کے علاوہ ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فطری جوہر اور اپنی اعلیٰ دماغی استعداد کا صحیح مصرف نہ لے سکے۔" ان جملوں میں کم از کم غالب کے فطری جوہر اور اعلیٰ دماغی استعداد کا اعتراف تو کیا گیا، غالب کی شاعری کا جادو کسی نہ کسی طرح سر پر چڑھ کر بول ہی دیتا ہے، اسی کے بعد

وہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گذر گیا، آج وہ مرزا جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے، کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں، کبھی نظیری کی، کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں، کبھی غالب کا، کبھی کسی کا کبھی کسی کا، یہ شعر ان کے تلون کی چغلی کھاتا ہے

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اس کے بعد ان کے تعریفی کلمات یہ ہیں کہ "خدا بھلا کرے نکتہ چینیوں کا جن کے تشدد سے تنگ آکر اخیر عمر میں میر تقی میر کو اپنا امام بنایا، جب کہیں راہ راست پر آئے، چنانچہ اپنے مکتوب میں خود اس امر کا اقرار کیا ہے کہ میں تو میر کے رنگ میں در آیا اور مومن خاں اپنی راہ چل پڑے، وہی آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے، غالب کی شاعری کی جان اور اردو لٹریچر کا سرمایۂ ناز ہے۔" (ص ۲۱)

یگانہ نے اوپر جو کچھ کہا ہے، اس کا لب و لہجہ شائستہ اور مہذب ہوتا تو ممکن ہے ان کی باتیں توجہ سے سنی جاتیں، ان کی رباعیاں اور اس قسم کی نثری تحریریں شائع ہوئیں، تو کچھ لوگ کہتے کہ ان کے دماغ کا توازن درست نہیں، وہ ان کو جواب دیتے کہ دماغ تو اتنا صحیح ہے، کہ دور سے بیٹھے بیٹھے اک ذرہ سی چونچ بتا دی اور ہزاروں غلیچیوں کو سری بنا کر جامے سے باہر کر دیا (ص ۲۹)۔ اور اگر کوئی یہ کہتا کہ وہ یہ سب شہرت طلبی کیلئے لکھتے ہیں تو ان کو وہ یہ جواب دیتے کہ مرزا یگانہ تو وہ شخص ہیں کہ حصول شہرت و شوق ہر دلعزیزی تو کجا اپنے اعزاز عرفی کو گذشتہ بیس پچیس سال سے مسلسل نقصان پہنچا رہے ہیں، اور دونوں ہاتھوں سے اپنے اعزاز و وقار کو لٹاتے رہتے ہیں، دوستوں کو بھی دشمن بنا لینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ (ص ۲۷)۔ وہ غالب شکنی کو ادبی خدمت سمجھتے رہے

جیسا کہ لکھتے ہیں "غالب کی شان میں میری مزاحیہ رباعیاں اور غالب شکن گل افشانیاں بظاہر ادبی معصیت سہی، مگر وہ دن دور نہیں جب یہی معصیت ایک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے گی"۔ یہ دعویٰ انھوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کے ایک مکتوب میں کیا تھا، جس کو لکھے ہوئے ۳۶ سال ہو گئے، اس درمیان میں غالب شکنی کیا ہوتی کہ غالب پرستی کا سیلاب اتنا بڑھا کہ مرزا یگانہ کا رسالہ غالب شکن اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتا نظر آتا ہے۔

انھوں نے اپنے اس رسالہ میں غالب پر چوریوں اور نقالیوں کے بھی الزامات رکھے ہیں، جس تلخ لب و لہجہ میں ان کو پیش کیا ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ کیا واقعی وہ غالب کی شان میں گستاخی مقصود ہے، لیکن میں ایسا سڑی نہیں کہ مردوں پر طعن اور وہ اس دنیا میں موجود نہیں، میری آواز ان کے کانوں تک پہنچ نہیں سکتی، تو یہ طعنہ زنی کوئی مردانگی نہیں، محض دیوانگی ہوگی، ہاں غالب کے دل چٹے جو غالب کو ایک آسمانی دیوتا بنا پیش کیا کرتے ہیں، ان کی بہکی ہوئی ذہنیتوں کو قلم کے زور سے کچل ڈالنا ایک ادبی فرض ہے" (ص ۳۹)۔ اس تحریر سے بظاہر تو یہی مراد ہے کہ وہ غالب کے مخالف نہ تھے، بلکہ غالب کے دل چٹے کو قلم کے زور سے کچلنا چاہتے تھے، جب قلم کا زور ہی دکھانا مقصود ہے تو اعتراضات کا جواب دینا بھی بیکار ہوگا، لیکن اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے تو کچھ ادبی ہلچل پیدا ہوئی، پھر دب گئی، لیکن پھر بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اس لیے انکا ازالہ ہو جائے تو اچھا ہے۔

یگانہ نے غالب کے کل اٹھاون اشعار کو تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی ہے، نسخۂ حمیدیہ میں ایک ہزار چار سو اٹھاسی اشعار ہیں، ان میں صرف اٹھاون اشعار کو چوری اور

نقالی ثابت کر کے پورے دیوان پر پانی پھیرنا بوالعجبی ہے، پھر بھی اٹھاون اشعار میں چودہ اشعار پر زور قلم دکھانے میں یگانہ جو تعریف کر گئے ہیں، اس کا خلاصہ ان کی تلخ اور ناروا باتوں کو حذف کر کے اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے،

(۱) غالب:۔ پڑھتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز ۔۔۔ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

عرفی:۔ عشق می گیرم و می گریم زار ۔۔۔ طفل نادانم و اول سبق است

یگانہ: شعر اگر مسروقہ نہیں تو اوریجنل بھی نہیں ہے۔

(۲) غالب:۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

صائب:۔ در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو ۔۔۔ عالم پر است از تو و خالی ست جائے تو

یگانہ: مطلع نہایت پاکیزہ و روشن، معانی کے لحاظ سے بہت بلند، انداز بیان کے اعتبار سے بھی بے عیب ہے، مگر اسے اوریجنل کہنا نادانی ہوگی، پرانا فلسفہ ہے، جسے غالب نے نہایت صفائی سے اردو میں بیان کر دیا ہے۔

(۳) غالب:۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ۔۔۔ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

ظہوری:۔ لذت زور دبسکہ دل زاریں گرفت ۔۔۔ ناخن زدم بہ داغ اگر بستدن گرفت

یگانہ:۔ صاف ظاہر ہے کہ غالب نے اس کی نقل اتاری ہے، مگر کامیابی کے ساتھ، ناخن بڑھ آنے کا اشارہ نہایت بلیغ ہے۔

(۴) غالب:۔ اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے ۔۔۔ تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

حزیں:۔ بہ لذت بود از قاتل حزین نیم بسمل را ۔۔۔ کہ در خوں می تپید آفریں می گفت بر دستش

یگانہ:۔ بڑا بانکا شعر ہے، مگر خیال حزیں کے ایک شعر سے پیدا ہوا ہے، جسے ترقی دیکر غالب نے نقل کو اصل سے بڑھا دیا ہے۔

(۵) غالب :- پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حزیں :- گراں جانِ ترز شبنم نیست جانِ ناتوانِ من اگر می بود دامن رُوے گرمیٔ آفتابش را

یگانہ :- دوسرا مصرع کتنا پیارا ہے، مگر پرتوِ خورشید کی جگہ پرتوِ خور اردو میں کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ شبنم و خورشید کا مضمون نہایت پامال ہے۔

(۶) غالب :- نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

قمی :- ہر کس کہ زخمِ کاریٔ ما را نظارہ کرد تا حشر دست و بازوے او را دعا کند

یگانہ :- شعر اگرچہ اوریجنل نہیں ہے، مگر اصل سے بڑھ گیا ہے۔

(۷) غالب :- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خسرو :- اے گل چہ آدمی نہ زمیں گو چگونہ اند آں رُوے ہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

یگانہ :- خوب شعر ہے، مگر اوریجنل نہیں ہے۔ امیر خسرو کے شعر میں بڑی قابلیت سے تصرف کیا ہے۔

(۸) غالب :- ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی :- باد چوں می رسم آسودہ می شوم از درد ندید حال مرا وقتِ بے قراری حیف

یگانہ :- غالب کا یہ شعر نہایت مکمل ہے، فسونی نے جس مشاہدہ کو قلم بند کیا ہے، غالب نے اسی کو کمالِ شعریت کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

(۹) غالب :- بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ظہوری :- تو نظر باز نئی ورنہ تغافل نگہ است تو زباں فہم نئی ورنہ خموشی سخن است

یگانہ :- نہایت لطیف شعر ہے، مگر تغافل میں نگاہ کا پایا جانا پرانا مضمون ہے۔

(۱۰) غالب :- خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

یگانہ :- نہایت تازہ شعر معلوم ہوتا ہے، شبِ ہجر میں موت کی دعا مانگا کرتے تھے قسمت

کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی دعا آگے آئی، شبِ وصل میں شادیٔ مرگ ہوئی، غالب کے بہتیرے ایسے نازک اشعار ہیں سرقہ ثابت ہو چکا ہے، اس وجہ سے بدگمانی (؟) ہوتی ہے کہ یہ بھی کہیں پرایا مال نہ ہو،

(۱۱) غالب :- نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

عاقل خاں رازی :- نہ مرا کرد رقیب از سرِ کوئے تو جدا اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگزشت

یگانہ :- شعر اپنی حدوں میں پورا ہے، زبان زدِ خاص و عام ہے، مگر پرایا مال ہے،

(۱۲) غالب :- زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

امعلوم :- زیں نام چہ تر کنم زبان را جاں بوسہ دہد سرِ زبان را

یگانہ :- خوب شعر ہے، مگر اوریجنل نہیں ہے، کہنے والا پہلے کہہ گیا ہے۔

(۱۳) غالب :- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

جلال الدین اصفہانی :- آں را کہ توئی یار چہ بے یار کس است واں را کہ توئی دوست چہ دشمن کام است

یگانہ :- واللہ مرزا غالب کا یہ شعر اتنا قیامت خیز ہے کہ جس کا جواب نہیں

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

نفسِ مطلب صرف روحِ شعر سے ہے، وہ دونوں جگہ واحد ہے، غالب نے بھی وہی کہا ہے مگر پہلے مصرع میں دوست کی فتنہ انگیزی کی طرف اشارہ کر کے شعر کو بہت ترقی دی ہے۔

(۱۴) غالب :- اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

یگانہ :- شعر بجائے خود مکمل ہے، جامِ جم پر جامِ سفالیں کی ترجیح نہایت لطیف ہے، خدا کرے یہ شعر غالب ہی کا ہو، کسی کی نقل نہ ہو۔

اوپر غالب اور فارسی شعراء کے اشعار غور سے پڑھے جائیں تو ان میں بعض تو بہت زیادہ

متحد المعانی نہیں ہیں، جن سے سرقہ کا الزام عائد ہو، اس کے باوجود وہ اگر پاکیزہ اور روشن ہیں، معانی کے لحاظ سے بہت بلند ہیں، انداز بیان کے اعتبار سے بے عیب ہیں، نہایت بلیغ ہیں، بانکے ہیں، پیارے ہیں، اصل سے بڑھے ہوئے ہیں، خوب ہیں، نہایت مکمل ہیں، نہایت لطیف ہیں، تازہ ہیں، قیامت خیز ہیں، تو یہ کسی سارق شاعر کا کارنامہ نہیں ہو سکتا ہے، یہ داد تو ایک قادر الکلام شاعر ہی اپنی مہارت ہی کی بدولت حاصل کر سکتا ہے، جامی نے اپنی مشہور تصنیف بہارستان میں سلمان ساؤجی کے ذکر میں لکھا ہے

"سلمان ساؤجی رحمۃ اللہ علیہ ایک فصیح شاعر اور بلیغ سخن گو ہیں، عبارات کی سلاست اور استعارات کی دقت میں بے نظیر ہیں، ان کے قصائد استادوں کے جواب میں ہیں، ان میں سے بعض اصل سے خوب تر اور بعض برابر ہیں، ان کے یہاں مخصوص معانی بہت ہیں، اور اپنے اشعار میں بہت سے معانی استادوں خصوصاً کمال اصفہانی سے ایراد کیے ہیں، لیکن وہ بظاہر خوب تر ہیں، اور اسلوب میں مرغوب تر ہو گئے ہیں، اسلیے وہ طعن و ملامت کے قابل نہیں۔" (بہارستان ص ۹۶)

اسی کے بعد وہ متین اشعار لکھتے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:-

ہنر است ایں کہ کہن خرقۂ پشمیں ز برش　　بدر آرند و در اطلس و اکسوں پوشند

اسی شعر کے معنی کے لحاظ سے اگر غالب نے کسی خیال کو لے کر اس کو اپنے خوب تر اسلوب اور مرغوب تر طرز ادا سے ریشم و اطلس کا خلعت پہنا دیا ہے، تو وہ طنز کے بجائے داد کے مستحق ہیں، غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی (مآثر الکرام جلد دوم ص ۷۷) جامی کی بہارستان سے مذکورۂ بالا عبارت نقل کی ہے، اور جامی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حسب ذیل شعر لکھا ہے:-

شاہد معنی کہ باشد جامہ الفاظش کہن　　نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش است

اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کسی شاہد معنی کو اس پرانے جامہ کے بجائے کوئی نکتہ داں نیا حریر کا لباس پہنا دے تو یہ خوبی ہے، آزاد بلگرامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علماء کا قول ہے کہ اگر کسی شاعر کا شعر پہلے کسی شاعر کے مضمون سے بلاغت میں بڑھا ہوا ہے تو یہ محمود ہے اور اگر گھٹیا ہے تو یہ مذموم ہے۔ اور اگر برابر ہے تو پہلے کی فضیلت اپنی جگہ پر درست ہونے کے باوجود دوسرے کا شعر مذمت کا مستحق نہیں، بشرطیکہ کھلا ہوا سرقہ نہ ہو۔ (مآثر الکرام ص ۷۷)

اب ۵ اشعار میں سے مذکورۂ بالا اشعار نکال دیے جائیں تو پھر ان میں سے دس اشعار کی مذمت یگانہ نے جن الفاظ میں کی ہے، ان کو تو پھر مسروقہ کہنا غلط ہوگا،

یہ اشعار ان کی رائے کے خلاصے کے ساتھ یہ ہیں:-

(۱) غالب:- شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

صائب:- ز مکر سبحہ شماراں خدا نگہدارد　　کہ صد سر است بیک حلقۂ کمند اینجا

یگانہ:- غالب کا شعر نہایت ذلیل ہے، ٹھونس ٹھانس کے سوا کچھ نہیں، اردو میں بیک کف بردن صد دل خاص دیوزاد کی زبان ہے، جو شعر گانٹھا ہے وہ اتنا بھدا اور ایسا عجیب الخلقت ہے کہ توبہ ہی توبہ۔

(۲) غالب:- ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

بیامی:- ہم از وفادار بدہ وعدۂ کہ من　　از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

یگانہ:- غالب کا شعر بفردا نمی رسم کی شانِ بلاغت کو نہیں پہنچ سکتا، اس کے علاوہ بیامی کے شعر میں ہم از وفادار کے فقرہ سے جو معنوی خوبیوں میں اضافہ ہو گیا ہے، اور وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے، آمادہ کیا ہے، اس مفہوم کا غالب کے شعر میں پتا تک نہیں۔

(۳) غالب:- غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے ۔ غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

عرفی:- غم نخورده است خوردنی امان خوان عشق ۔ اے اہل روزگار غم روزگار چیست

یگانہ:- عرفی کے شعر کی بلندی کو غالب نہ پہنچ سکے ۔

(۴) غالب:- میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں ۔ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

حزیں:- چہ شد کہ توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی ۔ پیش ابر کرم پیر مغاں این ہمہ نیست

یگانہ:- غالب کا شعر کوئی شعر نہیں ہے، کلام موزوں ہے ۔

(۵) غالب:- بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام ۔ رخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

بیدل:- حیا را ہم نقاب معنی نازش نمی خواہم ۔ کرمی ترسم عرق بر جبہہ بندد چشم غمازے

یگانہ:- غالب کا شعر نہایت ناقص ہے، کاٹ کے پھینک دینے کے قابل ۔

(۶) غالب:- میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد ۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

نامعلوم:- یاد ایام جنوں بر سر من بارد سنگ ۔ کودکاں را چو ز مکتب گہے آزاد کنند

یگانہ:- غالب کا شعر جتنا مشہور ہے، اتنا ہی مہمل، مہملیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے، دوسرا کچھ کہتا ہے، کوئی ایک مرکز خیال قائم ہی نہیں رہتا ۔

(۷) غالب:- ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ۔ بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

خیام:- گر میل تو با بے خرد و نااہل است ۔ من نیز چناں اہل و خردمند نیم

یگانہ:- چونکہ یہ مضمون حافتہ الورود ہے، اس لیے غالب کے اس شعر پر توارد کا حکم لگانا زیادہ صحیح ہے ۔

(۸) غالب:- حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز ۔ دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

شیدا:- گفتن دعا ز لطف تو تحصیل حاصل است ۔ با خضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

کا شعر تو گھٹا ہی لیکن گورکھ دھندا بن کر رہ گیا ۔

یگانہ: غالب کا شعر تو گھٹا ہی لیکن گورکھ دھندا بن کر رہ گیا ۔

(۹) غالب:- جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا ۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی:- نہ ز فروغ آفتابم نہ بود خبر کہ بے تو ۔ چہ دو زلف تست یکساں شب و روزم اندر ہیچ

یگانہ:- غالب کا یہ شعر بے معنی اور مہمل ہے ۔

(۱۰) غالب:- بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی ۔ سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

نعمت خاں عالی:- دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے ۔ آں قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

یگانہ:- غالب کے شعر کی بندش ایسی پھس پھسی ہے کہ فرفر پڑھنا چاہو تو زبان اٹکتی ہے، یہ شعر ناقص الخلقت، کاٹ کے پھینکنے کے قابل تھا ۔

اور یہ دعوی ہے کہ غالب نے صائب، پیامی، عرفی، حزیں، خیام اور شیدا وغیرہ کے اشعار سے چوری کی ہے ۔ جب غالب کے اشعار ان کے پرستاروں کے نزدیک تو نہیں، لیکن یگانہ کے خیال میں ذلیل، بھدے، عجیب الخلقت، مہمل، گورکھ دھندا، پھس پھسے اور کاٹ کے پھینکنے کے قابل ہیں، تو ان کو نقالی کیسے کہی جا سکتی ہے، چوری تو جب ہوتی کہ مذکورۂ بالا اساتذہ کے مقابلہ کے اشعار ہو جاتے ،

کبوتر خار بود بازِ بسیں خلعت او ۔ گر نہ در خوبیش از بیش تر افزوں شد

ان دس اشعار کو نکال دیا جائے تو پھر ۳۳ اشعار رہ جاتے ہیں، جن میں سے پانچ کو تو بیدل کی نقالی بتائی گئی ہے ۔

(۱۱) غالب:- میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ۔ میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

بیدل:- ہم چو عنقا بے نیاز عرض ایجادیم ما ۔ یعنی آں سوئے عدم یک عالم آبادیم

(۱۲) غالب:- گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا ۔ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدل :- دل آسودۂ ما شور امکاں در نفس دارد
گرد وا دیدہ است اینجا عنان ضبط دریا را

(۳) غالب :- صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

بیدل :- در طینت فسردہ صفاہا کدورت است
آئینہ می کند ہمہ زنگار آب را

(۴) غالب :- نہ کی سامان عیش جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

بیدل :- منزل عیش تو وحشت کدۂ امکان نیست
چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است اینجا

:- از وحشت ایں بزم بعشرت نتواں زیست
ہر چند چراغانش کفی پشت پلنگ است

(۵) غالب :- نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

بیدل :- ہیچ پرواز زخاکستر خود بالا است
بیدل ایں ہفت فلک بیضۂ یک فاختہ است

(۶) غالب :- زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے

بیدل :- دیدۂ ما کہ بنظارہ دل محرم نیست
مژہ باہم از دست ندامت کم نیست

حسب ذیل بارہ اشعار حزیں، نظیری، ظہوری، عرفی اور میر کے اشعار کے چربے بتائے گئے ہیں:

(۱) غالب :- تماشا کہ اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

حزیں :- جلوہ در خانۂ آئینہ بخود نمائی
گریہ انی کہ من حسرت دیدار چہ کرد

(۲) غالب :- فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

نظیری :- نشاط رفتہ ز دوراں بصبر بستانم
کہ بد معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

(۳) غالب :- کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نظیری :- راز دیرینہ ز رخ پردہ برانداخت دریغ
حال ما شہرہ بافشائے غزل ساخت دریغ

(۴) غالب :- ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر :- بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

(۵) غالب :- تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکل

میر :- سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

(۶) غالب :- عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

ظہوری :- شد طبیب ما محبت منت بر جان ما
محنت ما، راحت ما، درد ما، درمان ما

(۷) غالب :- غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

عرفی :- غم نعمتے است خوردنی اما ز خوان عشق
اے اہل روزگار غم روزگار چیست

(۸) غالب :- بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

عرفی :- وقت عرفی خوش کہ نگشودند چوں در بر رخش
بر در نگشودہ ساکن شد در دیگر نزد

(۹) غالب :- وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عرفی :- بکیش برہمناں آنکس از شہیدان است
کہ در عبادت بت روے بر زمیں می زد

عنایت صمدی رد کفر ما نہ کند
اگر کمال پذیرد صنم پرستی ما

(۱۰) غالب :- جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی :- نہ فروغ آفتابم نہ بود خبر کہ بے تو
چو دو زلف تست یکساں شب و روزم از سیاہی

(۱۱) غالب :- پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عرفی :- بیار بادہ کہ جانم ز دے ز نالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

(۱۲) غالب :- بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا
قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

عرفی :- ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

غالب کے ان تمام اشعار پر سرقہ کا الزام رکھنا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ اگر ان کے معانی و مطالب پر غور کیا جائے تو ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور نظر آئے گا، اس کے علاوہ یہ ڈھکی چھپی

بات نہیں کہ غالب نے اپنی مہارت فن کے ارتقائی مدارج طے کرنے میں بیدل، حزیں، عرفی، نظیری، ظہوری اور میر کا رنگ اختیار کیا، گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختیار کی تھی، اسی پر غالب نے چلنا اختیار کیا، لیکن پھر اس رنگ کو یہ کہکر چھوڑ دیا:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس لیے بیدل کے رنگ میں غالب کے جو اشعار نکل گئے ہیں، ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے ابتدائی دور کی شاعری میں بیدل کے رنگ کے اشعار بھی ہیں، حزیں کی تقلید میں ان کے فارسی اور اردو دونوں دواوین میں اشعار ملتے ہیں، مومن خاں کا تو خیال یہ تھا کہ ہم کسی طرح غالب کو علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ غالب نے اپنی فارسی شاعری کا تجزیہ کر کے یہ بتایا ہے کہ "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھکو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا، اس کو فنا کر دیا، ظہوری نے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا، اور نظیری نے اس خاص روش پر چلنا سکھایا،

یہی باتیں وہ اپنے فارسی اشعار میں مختلف طریقوں سے کہتے رہے۔

وہ عرفی کا بار بار حوالہ دیتے ہیں:

چوں نماز سخن از مرحمت دہر نجیش
کہ بر د عرفی و غالب بعوض باز دہد

قافیہ غالب چو نیست پس ز عرفی
گر من فرہنگ بود ے چہ غمے

کہتے ہیں کہ عرفی کی کیفیت غالب ہی کے یہاں ملے گی، دوسروں کے یہاں بادۂ شیراز نہ ملے گا۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

ایک جگہ تو شاعرانہ تعلی میں عرفی کو اپنے برابر نہیں سمجھا ہے۔

از جستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام
عرفی کہ است لیک نہ چوں من درین نجات

ظہوری کا ذکر بھی بہت کیا ہے، ایک جگہ تو کہتے ہیں کہ ظہوری انکی رگ جاں بنکر رہے ہیں،

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

اس کی جادو بیانی کے فیض کا بھی اظہار کیا ہے۔

بیاید ہم ز من انچہ ظہوری یافتم غالب
اگر جادو بیاں راز من وابستہ می باشد

اور یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ ظہوری کا شیوہ نطق اور نفس ان ہی کی وجہ سے زندہ ہے۔

غالب از من شیوہ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جاں در تن ساز بیانش کردہ ام

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

اور جن لوگوں نے ان پر طنز کیا تھا کہ وہ ظہوری کے زلہ ربا ہیں، ان کو یہ کہکر جواب دیا:

زلہ بردار ظہوری باش غالب تجبیت
در سخن درویشی باید نہ دکاں داری

ان کو اس کا بھی دکھ رہا کہ ان کا کلام نظیری کے رنگ کا نہ ہو سکا۔

غالب ز تو آں بادہ کہ خود گفت نظیری
در کاسۂ ما بادۂ سرجوش نکردند

غالب نظیری کے رنگ کے لیے تڑپتے ہیں تو کہتے ہیں

اے ساختہ غالب از نظیری
با قطرہ ریاے گوہر آور

اور جب نظیری کے رنگ میں کوئی غزل کہہ دیتے تو اس پر یہ کہہ کر ناز کرتے

بہ تازہ گشتہ غالب روش نظیری از تو
سزد ایں چنیں غزل را بہ سفینہ ناز کردی

اگر غالب کے فارسی دیوان کی چھان بین کیجائے تو اس میں ان اساتذہ کے قوافی اور

ردیف میں غالب کی بہت سی متوازی نظمیں اور قصائد ملیں گے۔

غالب کے بیانات اور اعترافات کے بعد ان پر یہ کہاں الزام آتا ہے کہ وہ اساتذۂ فن
کے اشعار کے چور تھے، وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ ان سے استفادہ کرکے ان کے رنگ میں اشعار
کہتے رہے، اور شاعرانہ بے راہ روی، آوارگی اور مطلق العنانی کے بجائے ان ہی کی بدولت
گیرائی اور خاص روش پیدا کی، لیکن مرزا یگانہ غالب کے اس اعتراف کو یہ رنگ دیتے
ہیں کہ وہ اپنی تلون مزاجی، شاعرانہ بوالہوسی اور سرگشتگی میں کبھی مرزا جلال کے مقلد رہے،
کبھی شوکت بخارائی کے، کبھی عرفی کی نقالی کرتے، کبھی نظیری کی، اور کبھی بیدل کا پیالہ
چاٹتے اور کبھی صائب کا، جس کو یگانہ غالب کی تلون مزاجی، شاعرانہ بوالہوسی، حیرانی
اور سرگشتگی پر محمول کرتے ہیں، وہ دراصل ایک بے قرار ذہن، ایک مضطرب شاعرانہ عبقریت
کی حیرانی اور سرگشتگی تھی، جن کی بدولت انھوں نے یگانہ سے نہیں لیکن اوروں سے یہ داد
حاصل کرلی کہ انھوں نے اپنی طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ اور رنگینی معنی سے صفحہ کو گلزار
بنا دیا، انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں نہ صرف بیدل، حزیں، نظیری، ظہوری بلکہ طالب آملی،
صائب، شوکت بخارائی، اسیر، غنی، ناصر علی، اور ناسخ کے اثرات قبول کیے، بلکہ میر، سودا
اور درد کی زمینوں میں بھی غزلیں کہیں، یہ ان کی نقالی یا چوری سمجھی جائے، لیکن اساتذہ
کے رنگ میں رنگنے کے بعد انھوں نے اپنا جو انفرادی رنگ پیدا کیا، وہ اردو شاعری کے
لیے بیش قیمت سرمایہ بن گیا، خود یگانہ کو اعتراف ہے کہ غالب کے آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید
اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے، وہ نہ صرف ان کی شاعری کی جان ہے، بلکہ
اردو لٹریچر کا سرمایہ ناز ہے (ص ۲۱) لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان کے آخر عمر کا کلام سراسر
میر کے رنگ کا ہے، میر کے رنگ میں انھوں نے کچھ دنوں تک کچھ اشعار ضرور کہے، لیکن ایسے

بعد ان کا جو امتیازی رنگ قائم ہوا، اس کے رنگ میں انھوں نے ایسے اشعار کہے جن میں
سے بعض اشعار کو یگانہ بھی پاکیزہ، روشن، بلند، بے عیب، بلیغ، بانکے، پیارے، لطیف،
تازہ، مکمل، اور قیامت خیز کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں،

غالب کے فارسی شعراء کے اتباع اور تقلید کا دور ختم ہوا تو پھر ان کا جو اپنا استادانہ
رنگ پیدا ہوا، اس کے متعلق وہ کہتے ہیں:

نظم و نثر شورش انگیزی کہ می باید بخواہ
اے کہ می پرسی کہ غالب در سخن یکتاست ہست

اور یہی وہ اپنی اردو شاعری کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی میں بھی ان پر سرقہ
کا الزام رکھا گیا، ایک قطعہ میں پہلے تو اپنے حاسدوں کو مخاطب کرکے یہ کہتے ہیں:

منکران شعر من اہل تا گموئی حاسدند
کایں قیاس از بہر شاں سامان نازے بودہ است

رشک از کالا شناسی خیزد و آں مایہ ایست
کاش باشد رشک کاں را ہم جوازے بودہ است

اور پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری ہزار معنوں پر مشتمل ہے، جو اہل ذوق کے نزدیک
شہد سے بھی بہتر ہے، اگر کہیں توارد ہو گیا ہے تو اس سے ان کی غزل کی آرائش ختم نہیں ہو سکتی
ہے، دوسروں کے لیے تو کسی اور شاعر کے خیال کی بلندی تک پہنچنا فخر کی بات ہوگی، لیکن
ان کے لیے یہ ننگ ہے، اور پھر چڑھ کر یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر ان کے شعر میں توارد پیدا ہو گیا
ہے تو اس کو چوری نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے نہانخانۂ ازل میں جو چیز پوشیدہ تھی، اس کو
دوسروں نے خود چرا لیا ہے،

ہزار معنی سرجوش خاص نطق من است
کز اہل ذوق دل و گوئی از عسل بردہ است

ز ذوقگاں بیکے گر توارد م رو داد
مداں کہ خوبی آرایش غزل بردہ است

مراست ننگ و لے فخر اوست کاں بہ سخن
بسعی فکر رسا جا بداں محل بردہ است

مبر گمان تو از یقین شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہانخانۂ ازل بردست

ان کے ایک اور قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں سرقہ کرنا عام تھا، بلکہ خود ان کے اشعار کے خیالات کی چوری ہوتی، کہتے ہیں کہ آجکل شاعر کی زبان پر گذشتہ اور موجودہ دور کے شاعروں کے خیالات ہوتے ہیں، اور ان پر اس طرح ناز کرتے ہیں کہ جیسے یہ تمام ان کے اصلی خیالات ہیں، اور چونکہ وہ ان خیالات کو خوبی سے ادا کر نہیں پاتے، اس لیے وہ اندرونی طور پر خوف زدہ رہتے ہیں، اور میں ان کی چوری سے واقف ہوجاتا ہوں، گو دوسرے انکی مدح خوانی کرتے ہیں، غالب پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ شاعری کوئی چک یا تمسک تو نہیں جس پر کسی خاص آدمی کا دستخط یا مہر یا نام ہو، یہ ایک نوٹ ہے کہ جس کے ہاتھ میں آجائے، اسی کی ملکیت ہے،

غالب دریں زمانہ ہر کس کہ وارسی
مضمون غیر ولفظ خودش بر زبان اوست

زیں مایہ از کجا کہ بنالد بخویشتن
بر گنج شایگاں کہ بود رایگان اوست

کس را ز دست برد خیالش نجات نیست
گر پیش از گذشتہ وگر در زمان اوست

مضمون ہر کرا خوش اوامی کند بناز
گوئی بہ بزم اہل سخن ترجمان اوست

اما بہ کنہ حسن ادا نارسیدہ است
می لرزد از نہیب دلم را ز دان اوست

جز من کسے بدزد سخن وانمی رسد
گو خوش بخواں کہ انجمنے مدح خوان اوست

آرے نہ چک بود نہ تمسک زہر کہ ہست
نے دستخط نہ مہر نہ نام و نشان اوست

مضمون شعر نوٹ بود فی زماننا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

اس قطعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار کی بھی چوری جاری تھی۔

(باقی)

بانی درس نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی، استاد شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۴)

ملا بحر العلوم مولانا بحر العلوم اپنے والد ماجد سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس میں دو تین سال کے بعد مشغول ہوئے، جبکہ ان کے نامور والد کا وصال ہوچکا تھا، تقریباً دس سال تک والد ماجد کی مسند درس کو زینت بخشنے کے بعد وہ حافظ رحمت خاں روہیلہ سردار کے پاس شاہجہاں پور چلے گئے، جہاں کم و بیش بیس سال تک تصنیف و تالیف و درس و تدریس میں مصروف رہے، شاہجہاں پور میں ان کے تلامذہ کے حلقے میں فرزندان حافظ رحمت خاں شہید بھی تھے، جن میں نواب محبت خاں محبتؔ قابل ذکر ہیں، جو دوسرے وجوہ سے تو تاریخی شخصیت بن چکے ہیں، لیکن ان کی علمیت اور بحر العلوم سے تلمذ پر مورخین کی خصوصی نظر نہیں پڑی، نواب محبت خاں کے پیر طریقت حضرت خواجہ علی اکبر مودودیؒ کے ملفوظ میں (جو ان کے خلیفہ خواجہ حسن مودودی لکھنوی نے ترتیب دیا ہے، اور جس کا نام لطائف اکبری ہے) ایک واقعہ درج ہے، جس کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دریں میاں بجامع علوم منقول و فنون	خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ نے اثنائے گفتگو
معقول نواب محبت خاں بہادر دامت عزتہ	میں علوم منقول و فنون معقول کے جامع
دربارۂ مولوی محمد نافع بن مولوی عبد العلی	نواب محبت خاں دامت عزتہ سے ملا

(بحر العلوم) بن ملا نظام الملۃ والدین الکھنوی قدس سرہ سفارشے فرمودند وارشاد نمودند کہ ہم چناں کہ حقوق والد شریف شما یعنی حافظ الملک الشہید حافظ رحمت خاں بہادر رحمہ اللہ سبحانہ بر والد شریف ایشاں یعنی مولوی عبد العلی سلمہ اللہ بسیار اند ہم حقوق ایشاں ہم بر شما بسیار اند بلکہ اقوی و اعلی ازاں چہ آنچہ از شما بہ ایشاں رسیدہ از فوائد دنیاویہ است وآنچہ از ایشاں بشما رسیدہ از فوائد دینیہ است چہ بسبب خدمات درسیہ وتعلیمات دینیہ کہ از استاذ نسبت بشما واقع شد، آنچہ از حسنات وخیرات وآنچہ برآں مترتب شود از حق سبحانہ در جزاء آں بشما رسیدہ پس آں از سبب ایشاں باشد وایں معنی اقوی واعلی باشد از وے، اگرچہ از خدمات شما کہ دربارۂ ایشاں واقع شد فوائد دینیہ وفوائد اخرویہ نیز مندرج ست چہ ایں معنی سبب رفع تشتت خواطر فضلا

نظام الدین لکھنوی قدس سرہ کے پوتے مولوی محمد نافع بن مولوی عبد العلی (بحر العلوم) کے بارے میں سفارش کرتے ہوئے فرمایا "جس طرح تمہارے والد ماجد حافظ الملک شہید حافظ رحمت خاں رحمۃ اللہ علیہ کے حقوق ان کے (مولوی محمد نافع کے) والد ماجد (ملا بحر العلوم سلمہ اللہ) پر بہت ہیں اسی طرح انکے (ملا بحر العلوم کے) حقوق بھی تم پر بہت ہیں، بلکہ اس سے زیادہ اور بلند درجے کے حقوق ہیں، اس لیے کہ ملا بحر العلوم کو تم لوگوں کے ذریعہ جو فوائد حاصل ہوئے وہ دنیاوی ہیں اور ان کے ذریعہ تم سب کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ دینی ہیں یعنی وہ فوائد جو تدریس و دینی تعلیم کے ذریعہ استاد سے تم کو پہنچے اور اس دینی تعلیم سے جو اچھائیاں اور نیکیاں تم کو نصیب ہوئیں اور ان نیکیوں اور اچھائیوں پر اللہ تعالی سے جو اجر و ثواب تم کو پہنچے گا وہ سب ان ہی کے سبب سے (استاد کے سبب سے) ہے، اس بنا پر استاد کے

گردیدہ تا مشغول بافاضۂ امور دینیہ بہ مردم گردیدند اما حقوق آخذ بر معطی زیادہ تر از حقوق معطی بر آخذ ست

(لطائف اکبری (قلمی) مملوکہ مولانا محمد میاں فرنگی محلی جانشین مولانا عبد الباری فرنگی محلی)

حقوق بلند درجہ اور زیادہ قوی ہیں بہ نسبت دنیاوی فوائد کے، اگرچہ تم لوگوں کی طرف سے ملا بحر العلوم کی جو خدمت ہوئی اسکے تحت بھی فوائد دینی اور اخروی آتے ہیں، کیونکہ امراء جو خدمتیں علماء کی کرتے ہیں وہ علماء و فضلاء کی پریشان حالی رفع کرنے کا سبب ہوتے ہیں اور (معاش کی فکر سے) بے فکر ہونے کے نتیجے میں یہ علماء دینی باتوں کو عامۃ الناس میں پھیلانے میں منہمک ہو جاتے ہیں، پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ لینے والے کے حقوق دینے والے پر اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے دینے والے کے حقوق لینے والے پر ہوتے ہیں۔

اس واقعہ سے نواب محبت خاں کے بارے میں جو محض اردو شاعر اور رئیس زادے کی حیثیت سے تاریخ میں مذکور ہیں، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ فارغ التحصیل عالم، "جامع علوم منقول و فنون معقول" تھے، اور ان کے استاد ملا نظام الدین فرنگی محلی کے نامور فرزند ملا بحر العلوم تھے،

ملا بحر العلوم شاہجہاں پور میں غلغلۂ درس بلند کرنے کے بعد نواب فیض اللہ خاں کی استدعا پر ریاست رام پور تشریف لے گئے، جہاں چار برس تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، نواب رام پور بحر العلوم اور ان کے شاگردوں کے پوری طرح کفیل رہے،

لیکن یہاں شاگردوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ایسی کثرت ہوئی کہ اس وقت کی ریاست کے بجٹ پر ان سب کی کفالت بار بننے لگی، اور ریاست کی طرف سے محدود رقم مقرر ہونے کی بات آنے پر مولانا بحرالعلوم دل برداشتہ ہوئے، اس کی اطلاع بوہار ضلع بردوان کے علم پرور رئیس منشی صدرالدین (میر منشی گورنر جنرل بہادر) کو ہوئی، انھوں نے درخواست کرکے اور انگریزی اثرات سے کام لے کر ریاست رامپور کو مجبور کر دیا کہ وہ ملا بحرالعلوم کو "مدرسۂ منشی صدرالدین" میں درس و تدریس کی رونق بڑھانے پر ہر قیمت آمادہ کرے، مولانا بحرالعلوم بوہار تشریف لے گئے، وہاں تلامذہ کی کثرت اور دور دور سے طالبان علم کی آمد منشی صدرالدین کے ذرائع آمدنی کے لیے بھی وجہ آزمایش بن گئی، اس صورت حال کی شہرت ہوتے ہی نظام حیدرآباد، سلطان ٹیپو اور نواب ارکاٹ (مدراس) تینوں نے بیک وقت درخواستیں اور عرضداشتیں مولانا بحرالعلوم کی خدمت میں قدم رنجہ فرمانے کی بھیجیں، مولانا نے نواب آرکاٹ کی عرضداشت کو شرف قبولیت اس لیے بخشا کہ وہ اصلاً قصبۂ گوپامئو (ضلع ہردوئی، اودھ) کے رہنے والے تھے، اور ان کو حق جوار حاصل تھا،

مولانا کے اس فیصلے پر نواب والاجاہ (آرکاٹ، مدراس) کو کتنی مسرت ہوئی اور ہم چشموں میں اپنے کو کتنا سربلند انھوں نے محسوس کیا، اس کا اندازہ اس انداز پذیرائی سے کیا جا سکتا ہے جو ملا بحرالعلوم کے وہاں پہنچنے میں نواب والاجاہ نے اختیار کیا،

"مدراس پہنچے تو بیرون شہر کے علما و اعیان دولت نے استقبال کیا، آپ (ملا بحرالعلوم) پالکی پر سوار اور تمام اعیان دولت پا پیادہ ہمراہ، اس شان سے نواب کے دولت خانے پر پہنچے، نواب دروازے تک مع شاہزادوں کے استقبال کو آئے، آپ نے پالکی سے اترنے کا ارادہ فرمایا، نواب نے کسی طرح اترنے نہ دیا اور خود پالکی کو کاندھا دے کر صدر مقام تک لے گیا،

مولانا کو صدر میں بٹھایا اور خود مؤدبانہ سامنے بیٹھا۔" (تذکرۂ علمائے "فرنگی محل" از مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی)

یہ تو نواب کے انداز استقبال کی شان تھی، جو بیان ہوئی، اور بحرالعلوم کی تشریف آوری کی شان کیا تھی، اس کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

"فسافر الیھا مع ست مأۃ نفس من رجال العلم" یعنی بردوان ضلع کے قصبۂ بوہار سے جب مولانا مدراس کے لیے آمادہ بسفر ہوئے تو ان کے ساتھ طالبان علم کا ایک بڑا گروہ تھا، جن کے افراد کی تعداد چھ سو تھی، مولانا بحرالعلوم مدراس پہنچے تو ان کے ہمراہ چھ سو طلبہ پر مشتمل پورا ایک جامعہ (یونیورسٹی) تھا، عالی ظرف نواب آرکاٹ نے جس شان انکسار سے بحرالعلوم اور ان کے چھ سو تلامذہ کا خیر مقدم کیا، ویسی ہی عالی حوصلگی سے اس نے بحرالعلوم کے لیے ایک الگ مدرسہ تعمیر کرایا، بحرالعلوم کے لیے گراں قدر مشاہرہ ان کے دامادوں ملا علاء الدین فرنگی محلی اور مولانا اظہار الحق فرنگی محلی کے لیے جداگانہ وظیفۂ تدریس اور جتنے طلبہ ہمراہ تھے سب کے لیے وظیفۂ تعلیم مقرر کر دیا۔

ایک جدید تصنیف "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" کے مصنف افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری (مدراس یونیورسٹی) نے قدیم دستاویزوں، تاریخی تحریروں اور سرکاری ریکارڈوں سے نواب والاجاہ محمد علی والی آرکاٹ (کرناٹک) کی دعوت پر ملا عبد العلی بحرالعلوم فرنگی محلی کے مدراس پہنچنے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک اہم خط کو بھی نقل کیا ہے، جس کا ذکر اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے:

"نواب محمد علی والاجاہ نے اپنے مدرسۂ کلاں کی صدر مدرسی کے لیے مولانا عبد العلی بحرالعلوم کو دعوت بھیجی، وہ ۲۴ ذی حجہ ۱۲۰۵ھ کو بہار (بوہار ضلع بردوان) سے مدراس پہنچے، ان کے ساتھ ان کے فرزند مولوی عبد الرب اور مولوی امام بخش اور

دوسرے بہت سے لوگ تھے۔ مولانا کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ مقرر ہوئی، مدراس اور آس پاس کے طلبہ ان کی خدمت میں بیٹھکر استفادہ کرنے لگے۔ مولوی محمد غوث (مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر) نے بھی تبرکاً کچھ پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر وہ کسی وجہ سے انکی درسگاہ میں شریک ہونے پر متردد تھے، آخر انھوں نے اپنے دادا قاضی نظام الدین احمد صغیر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق استخارہ کیا، اس رات خواب میں دیکھا، تو انھیں دلی مسرت ہوئی، وہ خود مولانا عبد العلی بحر العلوم سے مل کر اپنا خواب بیان کرنا چاہتے تھے لیکن حجاب دامنگیر ہو گیا، انھوں نے اپنے چچیرے چچا مولوی غلام عبد القادر فرزند مولوی محمد صادق فرزند محمد عبد الرشید شہید کے نام حسب ذیل خط لکھا:۔

قبلۂ من: الحمد للہ والمنۃ کہ بہ برکت
درود اجازت دادۂ آنحضرت شب را
بہ عجیب نعمت عظمیٰ فائز شدم تفصیلش اینکہ
بعد نماز تہجد استخارہ کہ از جد مرحوم بدا رحمہ اللہ
مضمنہ رسیدہ بود بعمل آوردم و نیت کردم
کہ استفادہ از حضرت مولانا افادہ اللہ علیٰ
من برکاتہ نمایم یا نہ و مرا فیض از ایشان
حاصل خواہد شد یا نہ۔ آخر دیر خواب نیامد
آخر نعاسی مستولی شد خود را در مجلس
جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یافتم
و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را نسبت بہ مولانا مد ظلہ

قبلۂ من! خدا کی حمد اور اس کا شکر ہے کہ
آنجناب کے اجازت دادہ درود کی برکت
سے رات عجیب نعمت عظمیٰ سے فائز ہوا، اسکی
تفصیل یہ ہے کہ میں نے تہجد کی نماز کے بعد
اس طریقے سے استخارہ کیا جو کہ مجھکو دادا مرحوم
سے (خدا انکی خوابگاہ کو ٹھنڈک سے بھرے)
ملا تھا، اور نیت یہ کی تھی کہ حضرت مولانا سے
(مولانا عبد العلی بحر العلوم سے) خدا انکی برکتوں
سے مجھے فائدہ پہنچائے، استفادہ کرنا چاہیے
یا نہیں، اور ان سے مجھ کو کوئی فیض حاصل ہوگا
یا نہیں، دیر تک نیند نہیں آئی اور آخر جب مجھ پر

دیدم حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ و ارضاہ باشارۂ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم قرابۂ چرمی یعنی ڈولچی
پر از آب زمزم آوردند و از دست خود
را نوشانیدند ہر چند در اثنائے نوشیدن
خواستم بس کنم لیکن خود دست نکشیدند
تا آنکہ شکم من از آب تا گلو پر شد در آں
وقت حدیث تضلع از آب زمزم بیاد
آمد و اشک از چشمہا رواں شد
بیدار گشتم در حالیکہ اشک جاری
بود و لذت آب زمزم در دہن
الحمد للہ علیٰ ذالک و صلی اللہ علیٰ نبینا
و آلہ و اصحابہ و تابعیہ الی یوم الدین
خواستم کہ خود رسیدہ التماس کنم لیکن

اونگھ غالب ہو گئی تو اپنے آپ کو جناب
رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پایا،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مولانا مد ظلہ سے
زیادہ مشابہ پا رہا تھا حضرت امیر المومنین
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وارضاہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے
ایک قرابۂ چرمی یعنی ڈولچی زمزم کے پانی سے
بھر کر لے آئے اور اپنے دست مبارک سے
مجھے پلانا شروع کیا، پینے کے درمیان میں
ہر چند اشارہ کرتا رہا کہ بس کریں مگر انھوں نے
اپنا ہاتھ نہیں کھینچا، یہاں تک کہ میرا پیٹ
حلق تک بھر آیا، اس وقت آب زمزم کے
بدولت علم سے بھرپور ہونے کی حدیث یاد آئی،
اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اسی
حالت میں جبکہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے بیدار
ہوا، زمزم کے پانی کی لذت ابھی تک منہ میں
تھی، الحمد للہ علیٰ ذالک وصلی اللہ علیٰ نبینا
وآلہ واصحابہ وتابعیہ الی یوم الدین۔
میں چاہتا تھا کہ خود ہی پہنچکر عرض کروں،

چونکہ برا امیر باغ جہت فاتحۂ امیر مرحوم
رفتہ بودم تاب آمدن آنجا نماند بجناب
حضرت مولانا رفتن و عرض این رویا
بسیار ضرور لیکن بسبب عدم ارتباط
ظاہری محجوب می شوم لہذا بخدمت
مصدع است کہ بخدمت مولوی
وجیہ اللہ صاحب سراپا اشتیاق
این ماجرا ظاہر فرمودہ بہر عنوان کہ
مناسب دانند اجازت از نواب صاحب
گرفتہ امروز در ینجا روانہ
فرمایند یا آنحضرت تکلیف
کشیدہ تشریف آرند و بندہ را فائز
جناب مولانا کنند چنداں قلق و
مشغولی حال است کہ مہلت فردا عین
قیامت است زیادہ چہ التماس نماید

لیکن چونکہ امیر مرحوم کی فاتحہ کے لیے
امیر باغ گیا ہوا تھا، اس لیے آنے کی
سکت نہ رہی، حضرت مولانا کی خدمت
میں پہنچکر اس خواب کا بیان کرنا ضروری
ہے لیکن ظاہری ارتباط نہ ہونے کی
بنا پر حجاب محسوس ہو رہا ہے، اسی لیے
آنجناب کو تکلیف دیجاتی ہے کہ مولانا
وجیہ اللہ سراپا اشتیاق سے یہ ماجرا
بیان کر کے یا کسی اور صورت سے
جس کو آپ مناسب سمجھتے ہوں نواب صاحب
کی اجازت لیکر آج ہی مجھے مولانا کی
خدمت میں لے چلیں یا آپ خود تکلیف
اٹھاکر یہاں تشریف لے آئیں اور مولانا
کی خدمت میں لیجائیں، اتنا قلق اور
اشتیاق مجھ پر غالب ہو گیا ہے کہ کل تک
کے لیے انتظار کرنا عین قیامت ہے،
اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے۔

اس خط پر لکھنے کی تاریخ نہیں ہے۔ مگر خط میں امیر مرحوم کی فاتحہ کا ذکر ہے، ان سے مراد نواب امیر الامرا مرحوم ہیں جو نواب محمد علی والاجاہ کے دوسرے فرزند تھے، اور جن کا

۲۴ر محرم ۱۲۰۳ھ کو انتقال ہوا تھا، چونکہ مولانا عبد العلی ۲۴ر ذی حجہ ۱۲۰۵ھ کو مدراس تشریف لائے تھے، اس لیے قیاس کہتا ہے کہ ۲۴ر محرم ۱۲۰۶ھ کا واقعہ ہے۔"

(خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" ص ۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱ مطبوعہ ۱۹۶۳ء)

نواب محمد علی والاجاہ کا انتقال ۱۲۱۰ھ (۱۳ر اکتوبر ۱۷۹۵ء) کو ہوا، اور ان کے بڑے بیٹے عمدۃ الامراء جانشین ہوئے اور چھ سال تک حکمرانی کی، نواب عمدۃ الامراء کا ۱۲۱۶ھ میں انتقال ہوا، اور سلطان ٹیپو سے ساز باز کے الزام میں انگریزوں نے ولیعہد نواب تاج الامرا علی حسین خاں بہادر پر زور ڈالا کہ وہ حکومت سے دست بردار ہو جائیں، اور گرانقدر وظیفے پر قناعت کریں، تاج الامراء کے انکار پر انگریزوں نے نواب والاجاہ کے مرحوم بیٹے امیر الامرا کے فرزند عبد العلی خاں کو گدی نشین کرنا چاہا تو ملا بحر العلوم اور دوسرے علماء نے فتویٰ جاری کیا کہ نواب عمدۃ الامراء کے حقیقی وارث تاج الامراء کے ہوتے کسی دوسرے کو گدی نشین کرنا شرعاً و قانوناً ناجائز ہے۔ مگر انگریزوں نے زور د زبردستی کر کے عبد العلی خاں (فرزند نواب امیر الامرا مرحوم) کو گدی نشین کر ہی دیا، اختیارات لے لیے اور تنخواہ جاری کر دی، عبد العلی خان نواب عظیم الدولہ کے لقب سے تخت نشین ہوئے اور مولوی محمد غوث ان کے دیوان (وزیر اعظم) مقرر ہوئے، اور شرف الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے، ریاست کے ملازمین بے روزگار ہو گئے جنھوں نے انگریزوں کے حکمراں ادارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو درخواستیں گزارنا شروع کیں، مولوی محمد غوث شرف الملک ان پر سفارشیں کرتے تھے، اکثر کی درخواستیں منظور ہو گئیں، یہ سب تفصیل خانوادۂ قاضی بدر الدولہ کے مصنف نے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس کے لیے ایک مستقل دفتر قائم ہوا جس کا نام "کرناٹک اسٹائپنڈس پے ماسٹر آفس" تھا اور یہ دفتر آج تک قائم ہے، یہ تمام اپیلیں ابتک اصلی صورت میں حاجی ابو احمد محمد عبید اللہ

کے پاس موجود ہیں۔ ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ملا بحر العلوم عبد العلی ہی ایک شخص تھے جنھوں نے انگریزوں کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا"۔ (ص ۱۵۷)

۱۲۱۶ھ سے لیکر ۱۳ رجب ۱۲۲۵ھ تک پورے دس سال تک ملا بحر العلوم امداد کہ بقید حیات رہے۔ اور مدراس ہی میں قیام بھی رہا، لیکن انگریزوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، حالانکہ ان کا مشاہرہ ایک ہزار روپیہ تھا، اور دو گانوں بھی جاگیر میں عمدۃ الامراء کے وقت میں دیئے گئے تھے۔

ملا بحر العلوم کی وفات کے بعد ان کے ورثا فرزند ملا عبد الرب، دوسرے فرزند کے بیٹے ملا عبد الواحد اور داماد و جانشین ملک العلماء، ملا علاء الدین بن ملا انوار الحق فرنگی محلی نے اپیلیں کیں اور ملا بحر العلوم کی تنخواہ کمپنی بہادر سے جاری ہو کر ورثا میں تقسیم ہونے لگیں۔

مولوی محمد غوث شرف الملک نے خواب دیکھنے کے بعد ملا بحر العلوم سے استفادہ کیا اور بہت فیض اٹھایا، یہاں تک کہ بڑی شہرت کے عالم اور صاحب تصانیف ہوئے، عربی فارسی میں ان کی علمی تصانیف آج بھی پائی جاتی ہیں، اور فارسی، اردو میں ان کی شاعری آج بھی قابل ذکر ہے۔

مولوی محمد غوث کی سب سے اہم تصنیف "نثر المرجان فی رسم نظم القرآن" سات جلدوں میں آج سے ساٹھ سال قبل حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے جس کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

ان الاستاذ النحریر ملاذ الصغیر	استاذ فاضل، چھوٹوں بڑوں کی پناہ گاہ،
والکبیر راقی مراقی العالم والحکم	علم اور حکمت کے درجوں کو طے کر چکنے والے
حامی مراسم المحامد والکرم حافی	نیک نفسی اور شرافت کے مراسم کے پشت پناہ
العلوم معقولا ومنقولا کافل	علوم معقول و منقول کے کامل، اصول و

الفهوم فروعاً واصولاً صاحب	فروع کی خوب سمجھ رکھنے والے، ذکر واذکار
الذکر والتقوی صاحب الفکر	اور تقوی و پرہیزگاری کے حامل، غور و فکر
والفتوی مولانا وموئلنا	اور فتوی نویسی میں صائب الرائے ہمارے
منبع الفیض الجاری ابا العیاش	آقا اور مرجع امید، دریائے فیض کے سرچشمہ
عبد العلی محمد بن نظام الملۃ	ابو العیاش عبد العلی محمد بن نظام الملۃ
والدین الانصاری متعہ اللہ	والدین انصاری نے (ان کے گلستان کے
بنعیم جناتہ ولاحرمنا من	ثمرات سے اللہ تعالی خلق کو متمتع کرے
فیوضہ وبرکاتہ قد شافهنی	اور ان کے فیض سے ہمیں محروم نہ فرمائے)
یوما بلطیف مقالہ وحرضنی	ایک دن مجھ سے اپنی پاکیزہ گفتگو میں فرمایا
بالوعظ اقوالہ علی انفاق الانفاس	اور اپنے دلنشین جملوں سے مجھے آمادہ
فی تصنیف کتاب لیکون تذکرۃ	فرمایا کہ ایک کتاب کی تالیف میں اپنے
حسنۃ عند الاحباب فان الکتاب	اوقات صرف کروں تاکہ احباب کے لیے
صدقۃ جاریۃ والی انظار	ایک اچھی یادگار رہ جائے، اس لیے کہ
الرجال ساریۃ فاشربت	تصنیف ہمیشہ رہنے والا کار خیر ہے اور
فی قلبی نصح موعظتہ	لوگوں کی نگاہوں میں رہنے والی چیز ہے،
ولما کان امر الاستاذ احری	انکی مخلصانہ نصیحت میرے دل میں رچ بس گئی
بالانقیاد وقد عاضدہ	.... اور چونکہ استاد کا حکم یوں بھی لائق
— نجل الرئیس الاجل الکبیر الحاسن	تعمیل ہوتا ہے پھر اس حکم کی تائید ....
ثابت جنگ بہادر عبد الغفار خاں .... فلم	نواب والا جاہ کے بیٹے محسن کبیر و رئیس
اجد للعدول مناصاً	ثابت جنگ بہادر عبد الغفار خاں نے بھی کی

اس کے بعد میرے لیے سوائے [illegible] کوئی [illegible] نہیں رہی۔ (نثر المرجان)

شرف الملک مولوی محمد غوث مدراس کے نامور علمی خانوادے کے ممتاز فرد تھے، اور
ان کے بڑے فرزند مولوی عبد الوہاب مدار الامراء نے بھی تبرکاً میزان الصرف (عربی صرف کی
پہلی کتاب) ملا بحر العلوم عبد العلی سے پڑھی اور عربی کی انتہائی کتابیں ملک العلماء مولانا علاء الدین احمد
فرنگی محلی سے پڑھیں، شرف الملک کے دوسرے فرزند قاضی صبغۃ اللہ بدر الدولہ نے بھی تبرکاً میزان الصرف ملا بحر العلوم سے
پڑھی، اور انتہائی کتابیں ملک العلماء، ملا علاء الدین احمد بن شیخ احمد انوار الحق فرنگی محلی سے پڑھیں، ملا علاء الدین
ملا بحر العلوم کے برادر عم زاد کے پوتے تھے، اور ملا بحر العلوم کے داماد اور شاگرد تھے اور مدراس میں ملا بحر العلوم
کے جانشین ہوئے، ان کا انتقال مدراس ہی میں ۱۲۴۲ھ میں ہوا۔

"خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" کے مصنف نے ملا بحر العلوم اور ان کے ہمراہی اعزہ و
اقارب کے سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"نواب محمد علی والاجاہ کا جب ۱۲۱۰ھ میں انتقال ہوا اور نواب عمدۃ الامراء
بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے ملا عبد العلی بحر العلوم کو ملک العلماء
کا خطاب دیا اور نذر کی پہلی تھالی ان کے دامن میں ڈال دی، نواب عمدۃ الامراء نے
ضلع چنگل پیٹھ میں جینور اور جعفرا پیٹھ کے دو قریے بطور جاگیر عنایت کیے تھے، جو نواب
کی وفات ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء کے بعد ضبط ہو گئے تھے، ان کے بدلے ماہوار رقم
مقرر کر دی گئی تھی۔ بحر العلوم نے انگریزوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا،
اور جب ۱۳ رجب ۱۲۲۵ھ کو بحر العلوم کا انتقال ہو گیا تو دو دن بعد ۱۵ رجب کو
ان کے داماد مولوی علاء الدین احمد کو "ملک العلماء" کا خطاب دے کر مدرسہ کلاں کا صدر مدرس بنا دیا تھا، اس
مدرسہ میں سلطان العلماء مولوی عبد الرب بن ملا بحر العلوم، اور قطب العلماء مولوی عبد الواحد بن مولوی
عبد العلی (بن بحر العلوم) کے علاوہ اور کئی اساتذہ کام کرتے رہے تھے۔" (ص ۴۰۸)

ملک العلماء، ملا علاء الدین احمد ہی مدراس میں آخر عمر تک مقیم رہے اور ملا بحر العلوم
کی جانشینی کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے ملا
جمال الدین احمد فرنگی محلی مدراس میں آخر عمر تک قیام پذیر رہے، اور رد وہابیت
کے معرکۂ عظیم میں جو وہاں تقویۃ الایمان (مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی) کے
سلسلے میں ہوا تھا، بہت پیش پیش رہے، مولوی میر محمد علی واعظ رامپوری نے حضرت
سید احمد شہید بریلویؒ، مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ اور اس گروہ کے دیگر علماء کے عقائد
کی بہت ترویج کی تھی جس نے مدراس میں دو گروہ پیدا کر دیے تھے، یہ قاضی بدر الدولہ کا
زمانہ تھا، سخت نزاع پھیل گئی، جس میں نواب آرکاٹ اور انگریزوں کو دخل دینا پڑا،
ملا جمال الدین احمد (نواسہ ملا بحر العلوم) نے اس میں یہاں تک دلچسپی لی کہ میر محمد علی سے
مسئلہ شفاعت پر مناظرہ کیا، اور میر محمد علی کو مجبور کیا کہ تقویۃ الایمان کی قابل اعتراض عبارتوں
سے اپنی برأت ظاہر کریں، میر صاحب نے مسجد والاجاہی میں بعد نماز جمعہ برأت نامہ تحریری
پیش کیا جو حاضرین کو سنایا گیا، مگر اس مجمل برأت نامہ سے ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی اور
ان کے ہم خیال مطمئن نہیں ہوئے، دوسرا برأت نامہ میر صاحب نے پیش کیا، مگر ایک طرف
برأت نامہ دوسری طرف ایسی تقریریں جن سے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ کی تعریف و توصیف
نکلتی ہو، میر صاحب کرتے رہے، آخر کار ملا جمال الدین احمد اور ان کے ہم خیال علماء نے
میر محمد علی واعظ رامپوری کے کفر کا فتویٰ دیدیا، اور انھیں واجب القتل قرار دیا گیا
قتل کا اختیار، نواب آرکاٹ کو نہ تھا، اس لیے ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی نے
ایک اور اشتہار تیار کر کے مسجد والاجاہی میں سنایا اور معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ شہر
مدراس کے چیف مجسٹریٹ نے میر صاحب کو بحفاظت تمام بذریعہ بحری جہاز مدراس سے

کلکتہ روانہ کر دیا۔ ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی نے اس کے بعد میر صاحب کے ایک ایک مرید سے فرداً فرداً توبہ کرانا شروع کر دی اور اصرار کیا کہ یہ لوگ اپنے گھروں میں نہیں، مسجد والا جاہی میں عام لوگوں کے سامنے توبہ کریں، نواب محمد علی والاجاہ مرحوم کی ایک بیوہ بھی میر صاحب کے مریدوں میں تھیں، ان کو بھی مجبور کر کے توبہ کرائی گئی، ملا جمال الدین احمد کسی طرح ان کو مستثنیٰ کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔

نزہۃ الخواطر کے فاضل مؤلف علامہ سید عبد الحی الحسنی رائے بریلوی نے ملا جمال الدین احمد کے ذکر میں لکھا ہے:

ثم رحل الی مدراس وولی التدریس فی المدرسة الوالاجاهیة مقام والده ونال منزل ابیه

(ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی نے لکھنؤ میں اپنے چچا ملا نور الحق سے تکمیل درس کیا) پھر مدراس چلے گئے، جہاں مدرسہ والاجاہی میں مدرس ہوئے اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے، اور اپنے والد (ملک العلما ملا علاء الدین احمد) کا مرتبہ پایا اور ان کے جانشین ہوئے۔

صاحب نزہۃ الخواطر کا خصوصی رجحان سید احمد شہید بریلوی کی تحریک کی طرف تھا جس کا اثر ان کی غیر جانبدار تاریخ نویسی پر برابر رہا ہے۔ اس لیے وہ ملا جمال الدین احمد پر آگے چل کر معترض ہوتے ہیں:-

وکان شدید الرغبة فی المباحثة شدید التعصب علی من خالفه

بحث و مباحثہ کے بڑے شوقین اور جو ان کے خلاف ہو اس سے سخت تعصب رکھتے تھے

طویل اللسان بالتکفیر والتضلیل

کافر اور گمراہ قرار دینے میں بڑے زبان دراز تھے،

مصنف نزہۃ الخواطر نے سخت الفاظ میں اعتراض جو کیا ہے تو اس کی وجہ بھی مخفی نہیں رہنے دی، اس کے فوراً ہی بعد لکھتے ہیں:-

کان یکفر الشیخ اسماعیل بن عبد الغنی الدهلوی علی ما مانسب الیه من عبارة فی کتابه تقویة الایمان یستدلون بها علی اسأة ادبه فی مقام النبوة۔ اعاذنا الله منها۔ والحق ان الشیخ ساحته بریئة من هذا القبیح وقد افرط الجمال فی ذالك وکان یکفر من یستحسن تقویة الایمان فضلا عن مصنفه حتی نال منه السید محمد علی الواعظ احد اصحاب سیدنا احمد بن عرفان الشهید البریلوی اذی کثیرا ببلدة مدراس

وہ مولوی اسمعیل دہلوی کی ان کی کتاب تقویۃ الایمان کی بعض منسوب عبارتوں کی بنا پر تکفیر کرتے تھے، اور ان عبارتوں سے لوگ حضرت رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں سوء ادب کا پہلو نکالتے تھے۔ خدا ہم سب کو ایسے سوء ادب سے بچائے۔ حق یہ ہے کہ مولوی اسمعیل اس قبیح حرکت سے بالکل بری تھے، جمال (یعنی ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی) اس معاملے میں حد سے گزر گئے تھے، وہ اس شخص تک کی تکفیر کرتے تھے جو تقویۃ الایمان کو اچھی کتاب سمجھتا تھا، مصنف تو رہے الگ یہاں تک کہ سید محمد علی واعظ کو جو سید احمد شہید بریلوی کے گروہ کے ایک فرد تھے، ان کے ہاتھوں سخت ایذائیں، شہر مدراس میں پہنچیں۔

یہ "سخت ایذائیں" وہی ہیں جن کی تفصیل "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" کے مصنف کے حوالے سے اوپر نقل ہو چکی ہیں، مگر اس کی تنہا ذمہ داری ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی پر نہ تھی، قاضی بدر الدولہ اور دوسرے علماء بھی اس میں برابر کے شریک تھے، اس کے علاوہ تقویۃ الایمان پر یہ مباحثہ تنہا مدراس ہی تک محدود نہ تھا، پورے ہندوستان میں تقویۃ الایمان نے دو حریف گروہ پیدا کر دیے تھے، اور دونوں اسی قوت سے متصادم بھی تھے، اول تو حد سے گذرنے کا گناہ "اکیلے جمال" (ملا جمال الدین احمد) نے نہیں کیا، ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کتاب کے خلاف یہی سب کچھ کرنے والے موجود تھے، دوسرے ایک ہی فریق حد سے نہیں گزرا، دوسرا فریق بھی اس مباحثے کے دوران بلکہ اس کے تذکرے کے وقت بھی توازن قائم رکھنے پر قادر نہیں رہ سکا، یہی اس عہد کا مزاج تھا، اس سلسلے میں کسی ایک کو مورد الزام قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

بہر حال ۱۲۷۵ھ میں ملا جمال الدین احمد فرنگی محلی کے انتقال کے بعد مدراس میں ملا بحر العلوم کی مسند تدریس ان کے گھرانے کے افراد سے خالی ہو گئی، لیکن ملا بحر العلوم کے ذریعہ بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی کا دریائے فیض جو رواں ہوا تھا وہ جنوبی ہند میں شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعہ پھیلتا رہا۔

ملا نظام الدین کے دریائے فیض سے جو چشمے پھوٹے ان میں سے ایک بحر ذخار بن کر شاہجہانپور، رامپور اور بردوان تک شمال مغرب اور مشرق میں پھیلنے کے بعد دکن تک وسیع ہو گیا، یہی وہ چشمہ تھا، جسے آج تک بحر العلوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، دکن میں دینی علوم کے استاد اول یہی ملا بحر العلوم ہوئے، جن کی جانشینی ان کے داماد ملا علاء الدین (حفید ملا احمد عبد الحق فرنگی محلی) نے کی، انکے بعد انکے بیٹے ملا جمال الدین ملا علاء الدین فرنگی محلی نے

درس و تدریس، وعظ و افتا و مناظرہ وغیرہ میں خاصا بلند درجہ مدراس میں حاصل کیا، یہ تینوں فرنگی محلی بزرگ مدراس ہی میں مدفون ہیں، اور ان کی علمی سرگرمیوں کی تاریخ نیز انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے تحت ریاست آرکاٹ کے حقوق میں دخل اندازیوں کے خلاف عوامی بیزاری کے سلسلے میں ملا جمال الدین اور ان کے والد اور نانا (بحر العلوم) کے برملا اقدامات کے تذکرے ریاست مدراس کے سرکاری کاغذات اور اس زمانے کے قلمی مخطوطات میں محفوظ ہیں۔

ملا احمد حسین فرنگی محلی

ملا نظام الدین کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا کے بیٹے ملا احمد حسین ان نامور تلامذۂ ملا نظام الدین میں تھے جنھوں نے ملا نظام الدین کے سامنے درس دینا شروع کر دیا تھا، اور ان کے بعد فرنگی محل میں ان کی مسند درس کی رونق گھٹنے نہیں دی تھی، ملا صاحب نے ان کو متبنیٰ بھی بنایا تھا، سوائے درس و تدریس کے ان کی زندگی کا اور کوئی مشغلہ نہ تھا، مولانا عبد الحی فرنگی محلی کے الفاظ میں :-

کان من اکابر العلماء واعاظم	بڑے علماء اور زبردست والشوروں
الاذکیاء ولم یزل مشتغلاً	میں تھے، ساری زندگی درس و تدریس
بالافادۃ واشاعۃ مراسم	اور شعار دین کی ترویج میں گزاری
الدین الی ان توفی	(ذخیرۃ السلف (قلمی)، منقول از آثار الاول من علمائے فرنگی محل)

لیکن ملا احمد حسین زیادہ مشہور نہ ہو سکے، اس کی وجہ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کی قلمی یادداشت میں انکے دیکھنے والوں کی زبانی اس طرح منقول ہوئی ہے،

زبانی مولوی نعیم اللہ صاحب بسماعت	مولوی نعیم اللہ فرنگی محلی (برادر زادہ و شاگرد
رسید کہ مولوی محمد مبین تلمیذ الشان بودہ	ملا مبین فرنگی محلی) کی زبانی میں نے سنا ہے کہ

وبسیار مدح وثنامی فرمودند و می
گفتند کہ در تبحر علمی زیادہ از مولوی
محمد حسن مرحوم بودند لیکن بہ باعث
بے تصنیفی دریں وقت شہرت آفاقی
نمی آرند در زمان حیات خود بسیار
نامور بودند و چنانچہ تفضل حسین[1]
خان صاحب ہم تلمیذ ایشان بودند

ملا محمد مبین فرنگی محلی ملا احمد حسین کے
شاگرد تھے (ملا حسن فرنگی محلی کے شاگرد
تو تھے ہی) اور ان کی بے حد تعریف و
توصیف کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ جہاں تک
تبحر علمی کا تعلق ہے ملا احمد حسین میں ملا محمد حسن
(ملا حسن) سے زیادہ تھا لیکن چونکہ ملا
احمد حسین کی کوئی تصنیف نہیں ہے اسلئے

---

[1] علامہ تفضل حسین خان (شاگرد ملا احمد حسین فرنگی محلی (ملا حسن فرنگی محلی) حکومت اودھ کے ایک نامور رکن تھے، اور غالباً پہلے آدمی ہیں جو "علامہ" کے نام سے اودھ میں یاد کیے جاتے ہیں، بڑے عالم، منطقی، فلسفی، منجم اور مغربی زبانوں کے جاننے والے اور حکومت انگریزی میں معزز تھے، یہی وہ علامہ تفضل حسین ہیں جن کے ایک شاگرد کی روزمرہ کی گفتگو کو دریائے لطافت میں نقل کرکے انشاء نے دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے، علامہ کا ایک شاگرد ایک شخص بادام سنگھ کے دیہاتی اور ان پڑھ خادم سے اس طرح بات چیت کرتے انشاء نے دکھایا ہے:-

"اس رئیس الاشقیاء بادام سنگھ نے خود کو کیا قرار دیا ہے کہ روس وعظارفہ سے دم تسادی مارتا ہے اور عواقب امور سے بے اندیشہ محض ہو کر طوالت تقاریر سے صماخ سامعین پریشان کرتا ہے، زمانے کا احوال علی الخصوص شتی ہے، یہ بات عقل سلیم اور ذہن مستقیم کے نزدیک استحسان نہیں رکھتی ہے، غایۃ مانی الباب یہ کہ سفہائے دماقین کے اذہان قاصرہ میں مرتسم ہو کہ یہ شخص اپنے اکفاء و اماثل و اقران میں طرار و طلیق و ذلیق لوذعی الہمی لایکل لسنہ فی الکلام ہے، لو فرض و سلم کہ کوئی اسکے مزخرفات پر افراط اغلاط سے مراد نہ ہو تو بھی اسکی مساوات ان اشخاص منیع القدر کے ساتھ امون کے ذادیتین کی طرح ساقین کی تساوی کے سبب ثابت نہ ہو گی۔"

و ہم چناں بسیارے از اکابر آں وقت
خود در سلک تلمذ ایشان درج
بودند و ہم بجماعت رسید کہ مولوی
حبیب اللہ ہم تلمیذ ایشان بودند
چنانچہ در مرض الموت از لبدہ فیض آباد
ہمراہ شاں بودند، مولوی صاحب
ایشان وصیت کردہ بودند کہ
در جانب شرق مزار ہم مکرم من
مولوی نظام الدین محمد قدس سرہ
بالاتصال مرا دفن خواہند نمود، ہ
چنانچہ مولوی حبیب اللہ مرحوم
شب عاشور باعانت ....
و نیز دن ...... بہ باعث ایام
محرم الحرام ...... دفن نمودند

اس زمانے میں وہ عالمگیر شہرت نہیں
رکھتے ہیں، اپنے زمانے میں وہ بہت
مشہور تھے، چنانچہ تفضل حسین خاں صاحب
(علامہ تفضل حسین خاں استاذ نواب
سعادت علی خاں وزیر الممالک) بھی
ملا احمد حسین کے شاگرد تھے (علامہ تفضل حسین
ملا حسن فرنگی محلی کے بھی شاگرد تھے) اور
ان کے زمانے کے بہت سے بڑے بڑے
لوگ ملا احمد حسین کے سلسلۂ تلمذ میں داخل
تھے، یہ بھی ان سے (مولوی نعیم اللہ سے)
سنا ہے کہ مولوی حبیب اللہ (انکے والد)
بھی ملا احمد حسین کے شاگرد تھے، اور ملا احمد حسین
فرنگی محلی جب فیض آباد سے (جو اس زمانے میں
اودھ کی راجدھانی تھی) واپس آنے
میں مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، تو انھوں نے
اپنے شاگرد اور برادر عم زاد کے پوتے (مولوی
حبیب اللہ) کو وصیت کی کہ عم محترم ملا
نظام الدین محمد قدس سرہ کے مزار کے مشرق

نوٹ:-
(اصل قلمی تحریر کے الفاظ بالکل پڑھے نہ جا سکے اور کچھ مشکوک نظر آئے اسلیے غیر ماثور الفاظ کی جگہ نقطے بنا دیے گئے ہیں)

قرطاس اور کاغذ تاریخ کی روشنی میں

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب. ایم اے. پی. ایچ. ڈی (لنڈن) سابق پروفیسر عربی
پنجاب یونیورسٹی. لاہور

عالم اسلام میں کتابت کے لیے بالعموم دو چیزیں مستعمل رہی ہیں، اول قرطاس اور دوسرے کاغذ۔ ان کے علاوہ رق یعنی چمڑا بھی تحریر کے لیے استعمال میں رہا ہے لیکن مقابلۃً بہت کم۔ اکثر لوگوں نے اور خصوصاً متاخرین نے قرطاس اور کاغذ کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا ہے، چنانچہ قرآن پاک کے اردو تراجم میں قرطاس کا ترجمہ کاغذ کیا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصلیت، ترکیب و ساخت اور تاریخ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، قرطاس تو قدیم زمانے میں مصر میں فافیر (Papyrus) یعنی بردی کے پودے کے گودے سے تیار ہوتا تھا اور مسلمان اپنے دور حضارت میں نوشت و خواند کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسی چیز سے آشنا ہوئے اور اسے دو تین سو سال تک کام میں لاتے رہے، لیکن اس کے برعکس مروجہ کاغذ چین میں پہلی صدی عیسوی میں ایجاد ہوا اور پھر آٹھویں صدی (یعنی دوسری صدی ہجری) میں کاغذ کی صنعت چینی قیدیوں کے ذریعہ سے سمرقند (ترکستان) میں جاری ہوئی، اور بعد ازاں خراسان اور بغداد کے راستے سے تمام اسلامی ملکوں میں پھیل گئی، اور کاغذ کے روز افزوں استعمال سے قرطاس رفتہ رفتہ ہر جگہ متروک ہو گیا، اور اس کی جگہ کاغذ نے [illegible] لی۔ مقالہ ہٰذا کے

پہلے حصہ میں قرطاس اور دوسرے حصہ میں کاغذ کے متعلق چند ضروری معلومات ہدیۂ ناظرین ہیں، چونکہ قرطاس کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے، اس لیے امید ہے کہ یہ مقالہ علم تفسیر کے لحاظ سے بھی ناظرین کرام کی توجہ اور دلچسپی کا مستحق ہوگا۔

(۱) قرطاس

قرطاس مصر کی خاص پیداوار تھی، اس لحاظ سے کہ وہ مصر ہی میں تیار ہوتا تھا، اور وہاں لکھنے کے کام میں آتا تھا، چنانچہ ابن الندیم بغدادی نے لکھا ہے کہ "کتب اہلِ مصر فی القرطاسِ المصری ویُعمل من قصب البردی"[۱]، یعنی اہل مصر مصری قرطاس پر لکھتے تھے، اور وہ بردی کے پودے سے بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی (متوفی [illegible]ھ) نے کتاب الہند میں تحریر کیا ہے کہ "ان القرطاس معمولٌ بمصر من لُبِّ البردی یُبری فی الحمہ وعلیہ صدرت کتبُ الخلفاء الی قریب من زماننا۔" یعنی قرطاس مصر میں بردی کے گودے کو کاٹ کر بنایا جاتا اور ہمارے قریبی زمانہ تک خلفاء کے فرامین اسی قرطاس پر صادر ہوتے رہے ہیں۔

اہل مصر کے برعکس بابل اور اشور (Assyrea) کی قدیم مملکتوں کے باشندے لکھنے کے لیے مٹی کی چوڑی چوڑی لوحیں یا تختیاں استعمال کرتے تھے، جب یہ تختیاں ابھی گیلی ہوتیں تو جو کچھ لکھنا مقصود ہوتا، نے کے قلم سے ان پر نقش کر دیتے تھے، اور پھر ان کو سکھا کر تنور میں پکا لیتے، اس طرح سے یہ تحریر ایک پائیدار صورت اختیار کر لیتی تھی۔ لوح پر نوک قلم کے دبانے سے حروف کی جو شکل بنتی تھی وہ فانہ یا میخ کی مانند نظر آتی ہے، اس لیے اس بابلی خط کو آجکل خط میخی یا مسماری (Cuneiform) کہتے ہیں، گذشتہ صدی میں مغربی علماء نے قدیم آثار کی تلاش میں جب بابل اور اسکے گرد و نواح

---

[۱] کتاب الفہرست لابن الندیم صفحہ ۳۱، مطبوعہ مصر۔

یں کھدائی کی تو ان کو وہاں کے کھنڈروں میں اس قسم کی ہزاروں تختیاں ملیں، ان میں سرکاری فرمان، نجی خطوط، بیع نامے، رسیدیں، حساب کی یادداشتیں، غرضکہ ہر قسم کی دستاویزیں پائی گئی ہیں، جن سے اس قدیم زمانہ کی زندگی پر نہایت دلچسپ روشنی پڑتی ہے، شہر نینوی کے شاہی محلات کے کھنڈروں میں اشور بنی پال (Assurbanipal) کے عہد کا ایک پورا کتب خانہ دریافت ہوا ہے جو بائیس ہزار تختیوں پر مشتمل ہے اور اب لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، ایک دستاویز میں یہ مشہور بادشاہ فخریہ لہجہ میں لکھتا ہے کہ "میرے باپ نے مجھے نہ صرف تیر اندازی اور شہسواری سکھائی بلکہ مٹی کی تختیوں پر لکھنے کی تعلیم دی اور اپنے زمانے کی تمام حکمت کی تلقین کی۔"

ظاہر ہے کہ کتابت کا یہ طریقہ بڑا بھدا تھا، اس لیے لوگوں کو کسی ایسے سامان نوشت کی ضرورت تھی جو اینٹ کی طرح بھاری اور بھدا نہ ہو، چنانچہ مصر کے قدیم لوگوں نے بردی کے پودے سے از قسم ورق ایک ایسی چیز تیار کی جو لکھنے کے لیے مٹی کی الواح کے مقابلہ میں بہت زیادہ موزوں تھی، اس ورق کو یونانیوں نے Papyros اور عربوں نے قرطاس کہا ہے۔ بعض قدیم مصنفوں نے لکھا ہے کہ یہ پودا مصر کے علاوہ شام، دریائے فرات اور دریائے نائجر کے کناروں پر بھی پایا جاتا تھا، لیکن اس سے ورق تیار کرنے کی ترکیب اہل مصر کے سوا اور کسی قوم کے ذہن میں نہیں آئی، اور قرطاس کی ایجاد سے اہل مصر نے نہ صرف اپنی ضرورتوں کو پورا کیا بلکہ دساور کو بھیج کر کے دوسری قوموں کی بھی بیش بہا خدمت انجام دی۔

بردی کا بیان

بردی کا پودا قدیم زمانے میں مصر میں دلدلوں اور تالابوں کے کنارے بکثرت پیدا ہوتا تھا، اور اب بھی مصری امراء کے باغات کی زینت ہے، یہ پودا

آٹھ دس فٹ کی بلندی تک بڑھتا ہے، اور اس کے سر پر خوبصورت شگوفے پھوٹتے ہیں، اس کا تنا تکون شکل کا اور موٹائی میں انسان کی کلائی کے برابر ہوتا ہے، اس میں بانس کی طرح گرہیں نہیں ہوتیں، بلکہ سرکنڈے کی مثل نرم گودا ہوتا ہے، اسی گودے کو کاٹ کر اس سے ورق بناتے تھے جس کی کیفیت اور ترکیب آئندہ صفحات میں بیان ہوگی۔

بردی کا صحیح بیان ہمیں سب سے پہلے ارسطو کے شاگرد تاؤفرسطس[1] کے ہاں ملتا ہے، چنانچہ وہ اپنی کتاب النبات میں لکھتا ہے کہ یہ پودا تقریباً دو ہاتھ گہری دلدل میں اگتا ہے، اس کی سب سے بڑی جڑ انسان کی کلائی کے برابر ہوتی ہے، اور دس ہاتھ کی لمبائی تک بڑھتی ہے، یہ جڑ افق کے متوازی ہوتی ہے، اور اس سے چھوٹی چھوٹی اور جڑیں بھی پھوٹتی ہیں، اور دلدل کی مٹی میں دھنس جاتی ہیں، اس پودے کا تنا چار ہاتھ کی بلندی تک پہنچتا ہے اور شکل میں تکون اور گاؤدم ہوتا ہے۔

ابن البیطار نے کتاب الجامع لمفردات الادویہ میں بردی کا قدیم مصری نام نافیر لکھا ہے، مگر ابن حوقل نے اس کا نام بابیر یا بیبیر بتایا ہے، دراصل یہ وہی قدیم مصری نام ہے جس کو یونانیوں نے (Papyros) اور رومیوں نے (Papyrus) کی صورت میں لکھا تھا، قیاس چاہتا ہے کہ اصل مصری نام میں غالباً "پ" ہوگی، جسے یونانیوں نے P سے ادا کر دیا، مگر عربی حروف ہجا میں پ مفقود ہے، اس لیے عربی املا میں اسکی جگہ ب یا ف نے لے لی، اور عربوں نے اسے بابیر یا فافیر کی صورت میں لکھا۔

---

[1] تاؤفرسطس (Theophrastos) متوفی ۲۸۷ قبل مسیح ارسطو کا شاگرد اور جانشین تھا، اس نے ارسطو کے بعد اس کی تعلیم کو جاری رکھا اور اس کے دبستان فلسفہ کی تنظیم کی، ابن الندیم بغدادی اسکے نام اور کام سے بخوبی واقف تھا، ملاحظہ ہو کتاب الفہرست صفحہ ۳۵۳، مطبوعہ مصر۔

یونانی کلمہ (Papyrus) کے اخیر میں جو s ہے وہ اس کے حروف اصلیہ میں سے نہیں ہے، بلکہ زائد ہے، اور یونانی زبان کے قواعد کی رو سے اسم کی حالت فاعلی کو ظاہر کرتا ہے۔ Papyrus دراصل پودے کا نام تھا، پھر یہی لفظ اس ورق کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو اس سے بنایا جاتا تھا، انگریزی زبان کا لفظ Paper اسی کلمہ سے ماخوذ ہے۔

عربوں نے نافیر کے پودے کو بردی کہا ہے، اور صاحب تاج العروس نے ذیل مادہ برد تصریح کر دی ہے کہ بردی کا تلفظ فتحہ کے ساتھ ہے، جب اس پودے کا نام بردی ٹھہرا، لہٰذا عربوں کے ہاں قرطاس کا دوسرا نام ورق البردی ہے، اختصار کے خیال سے کبھی ورق البردی کو محض بردی کہہ دیتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کَتَبَ علی البردی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاں شخص نے ورق البردی یعنی قرطاس پر لکھا۔

چونکہ قرطاس ایک ایسے پودے سے تیار ہوتا تھا جو نَے کی قسم سے تھا، اور نَے کو عربی میں قَصَب کہتے ہیں، اس لیے عرب مصنفوں نے قرطاس کو وَرَقُ القَصَب بھی لکھا ہے۔

جب عربوں نے مصر فتح کیا تو اس کے بعد بھی مصری لوگ بردی کی کاشت کرتے رہے، اور اس سے قرطاس بدستور بناتے رہے، یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں کاغذ نے رفتہ رفتہ اس کی جگہ لے لی، اور چوتھی صدی ہجری میں قرطاس بالکل متروک ہوگیا۔

تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں جب عربوں نے صقلیہ (سسلی) فتح کیا تو انھوں نے

وہاں بردی کی کاشت کو رواج دیا، چنانچہ ابن حوقل جب چوتھی صدی میں وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کے صدر مقام بَلَرمُ (Palermo) کے نواح میں بردی بکثرت اگتا ہے، شہر سرقوسہ (Syracusa) کے نزدیک یہ پودا اب بھی پایا جاتا ہے، اور بعض لوگوں نے اس سے ازراہ تفنن ورق تیار کرنے کی کوشش کی ہے جو قدیم زمانے کے قرطاس سے ملتا جلتا ہے، اسکندریہ میں بھی مقامی بردی سے قرطاس سازی کا تجربہ کیا گیا ہے۔

قرطاس بنانے کا طریقہ

بردی سے ورق تیار کرنے کا جو طریقہ قدیم مصریوں کے ہاں رائج تھا، اس کا ذکر رومی مصنف پلینی (Pliny) متوفی ۷۹ء نے اپنی نیچرل ہسٹری میں کیا ہے، لیکن اس کا بیان قدرے مبہم ہے، اور علماء نے اس کی تفسیر و تفہیم میں بڑی دماغ سوزی کی ہے، نیز ابوالعباس نباتی کی زبان سے بھی ابن البیطار کی "مفردات" (صفحہ ۸۱) میں یہ طریقہ مذکور ہے، ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصری اس پودے کے تنے سے ایک ایک فٹ لمبے ٹکڑے کاٹ لیتے اور ان کو لمبائی کے رخ دو حصوں میں شق کر کے پانی میں ڈال دیتے تھے، نرم ہونے پر تیز چھری کے ساتھ ان کے پتلے پتلے قتلے کاٹتے، جن کی چوڑائی ایک انچ کے قریب ہوتی تھی، اور پھر ان کو لکڑی کی ایک صاف تختی پر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بچھا دیتے تھے، پھر ان پہ پتلی سی گوند پھیلا کر اسی قسم کے قتلوں کی ایک اور تہ ان کے عرض میں بچھا دیتے، اگر موٹا ورق درکار ہوتا تو قتلوں کی ایک تیسری تہ چڑھا دیتے، مرطوب ہونے کے بعد بردی کے گودے سے ایک قدرتی لزوجت نکلتی تھی، اور یہ لیسدار مادہ بھی ان قتلوں کو باہم پیوست ہونے میں مدد دیتا تھا، اس طرح سے ایک ورق تیار ہو جاتا اور

جب قدرے سوکھ جاتا تو لکڑی کے ہتھوڑے سے اس پر ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے جس سے
ورق پیوستہ اور ہموار ہو جاتا، اور اس کا کھردراپن بھی دور ہو جاتا، یا اسے شکنجے
میں دبا کر ہموار کر لیتے، اور جہرہ یا ہاتھی دانت کے ٹکڑے سے گھونٹ کر ملائم بنا لیتے تھے۔
جو ورق جہرہ سے گھونٹ کر ملائم کیا جاتا، اسے عرب مصنفوں نے مُہرق کہا ہے
اور فارسی میں ایسے ورق کو جہرہ دار کہتے ہیں، ابن البیطار متوفی ۶۴۶ھ نے
اپنی کتاب "مفردات" میں سلیمان بن حسان کی روایت سے بردی کے ذیل میں یوں
لکھا ہے:-

ان اهل مصر تعرفه باسم	اہل مصر کے ہاں بردی فافیر کے نام سے مشہور
الغافر وهو نبات يوجد في	ہے، اور یہ ایک پودا ہے جو پانی میں پایا جاتا
الماء له ورق كخوص النخل	ہے، اس کے ورق کھجور کے پتوں کے مانند
وله ساق طويلة خضراء	ہوتے ہیں، اس کا ایک لمبا تنا ہوتا ہے
مائلة الى البياض ويتخذ	جس کی رنگت سفیدی مائل سبز ہوتی ہے،
من هذا النبات كاغذ ابيض	اس پودے سے سفید رنگ کا کاغذ بنایا
يقال له قرطاس فمتى قيل	جاتا ہے جس کو قرطاس کہا جاتا ہے جب
في الطب قرطاس محرق	علم طب میں قرطاس محرق کا ذکر آئے
فانما يراد به القرطاس	تو اس سے وہی قرطاس مراد ہے جو بردی
الذي يكون من البردي	کے پودے سے بنتا ہے۔

مندرجۂ بالا عربی عبارت کتاب مذکور کے مطبوعہ اڈیشن سے منقول ہے، اگر اس نسخہ
میں دو لفظ غلط چھپ گئے ہیں، اول غافر کی بجائے فافیر پڑھنا چاہیے اور دوسرے میرا

خیال ہے کہ قرطاس محرق غالباً قرطاس مہرق کی تصحیف ہے، اس عبارت سے بہرحال
زیر بحث مطالب کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب میں ۱۹۳۰ء میں برلن میں وارد ہوا، تو مجھے
وہاں آثار قدیمہ کے سرکاری میوزیم میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، اس کا ایک بڑا ایوان
قدیم مصری آثار کے لیے مخصوص تھا، اس کی ایک دیوار پر میں نے ایک نقشہ یا چارٹ
آویزاں دیکھا، جو ایک شیشہ کے چوکھٹے کے اندر بڑے قرینہ سے آراستہ تھا، اس نقشہ
میں تصاویر کے ذریعہ سے قرطاس سازی کے طریقہ کو دکھایا گیا تھا، اور اس صنعت کے
تمام مراحل کو تصاویر کے ذریعہ سے واضح کیا گیا تھا، جن کو کسی چابک دست ہنرور
(آرٹسٹ) نے تیار کیا تھا، پہلی تصویر بردی کے پورے پودے کی تھی، جو ایک جوہڑ کے
کنارے ہوا میں لہلہا رہا تھا۔ اس کے بعد دیگر تصاویر میں اس کے مختلف حصوں یعنی
اس کے تکون تنے، اس کی شاخوں اور اس کے خوبصورت شگوفوں کو الگ الگ تفصیلاً
دکھایا گیا تھا، اس کے بعد ورق سازی کے مختلف مراحل کی وضاحت تھی، میرا خیال ہے کہ
یہ نقشہ قدیم کتابوں کے بیانات کی روشنی میں تیار کیا گیا تھا، کیونکہ اس میں قرطاس سازی
کا جو طریقہ دکھایا گیا تھا وہ تقریباً وہی تھا جو سطور بالا میں مذکور ہوا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے حاکم المنذر بن ساوی کے نام جو تبلیغی
مراسلہ بھیجا تھا، اور جس کی عبارت بعض کتب سیرت میں محفوظ ہے، اس کا اصل گذشتہ
صدی میں منظر عام پر آیا تھا، اس کا فوٹو گراف جرمن اورینٹل سوسائٹی کے مجلہ
بابت ۱۸۶۳ء میں چھپا تھا اور اس کی نقل ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی فرانسیسی سیرت
نبوی میں بھی مندرج ہے، اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مراسلہ قرطاس پر لکھا گیا تھا،

کیونکہ اس میں بردی کے ریشے اور اس کی پٹیاں یعنی قتلے جن کے باہم جوڑنے سے قرطاس کا ورق تیار ہوتا ہے، صاف دکھائی دیتے ہیں، عمودی پٹیوں کا عرض ۳/۴ انچ ہے، اور افقی پٹیاں عرض میں ۱ ۱/۵ انچ کے قریب ہیں، مراسلہ کے کونے گر چکے ہیں، قرطاس اور عام کاغذ میں یہ فرق ہے کہ کاغذ کی بافت اور بناوٹ یکساں ہوتی ہے، لیکن قرطاس کے بوسیدہ ہونے کے بعد بردی کے گودے کے ریشے اور اسکی پٹیاں اکثر اوقات صاف نظر آتی ہیں، بہر حال اس فوٹوگراف سے قرطاس کی ساخت پر بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ہے، اور قدیم کتابوں میں قرطاس کی بناوٹ کی جو کیفیت لکھی ہے، اس کی تشریح و تصدیق ہوتی ہے۔

عربی قرطاسوں کی بہت سی عکسی نقلیں ان کتابوں میں شائع ہو چکی ہیں جو پروفیسر مارگولیتھ اور پروفیسر گروہان نے عربی قراطیس کے بارے میں تالیف کی ہیں، اور جن کا ذکر اس مقالہ میں آئے گا۔ ان نقول میں قرطاس کی بافت اور ساخت کی کیفیت کم و بیش ویسی ہی ہے جیسی کہ مذکورہ بالا مراسلہ کی نقل میں مشاہدہ میں آئی ہے۔

قرطاس دیارِ عرب میں | فافیر یا بردی سے جو ورق تیار ہوتا تھا، وہ نہ صرف مصر میں لکھنے کے کام آتا تھا، بلکہ بیرونی ملکوں میں بھی بکثرت برآمد ہوتا تھا، قدیم عرب بھی اس سے بخوبی واقف تھے اور اسے قرطاس کہتے تھے، قرطاس کے قاف پر تینوں حرکات آئی ہیں، یہ لفظ اعشیٰ اور دوسرے جاہلی شعراء کے کلام میں ملتا ہے، اور قرآن پاک (سورۂ انعام آیہ ۷) میں بھی اس کا یوں ذکر آیا ہے:-

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي
قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ

یعنی اگر ہم تجھ پر (اے نبی) قرطاس پر
لکھی ہوئی کتاب اتارتے اور یہ لوگ

لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا
إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ۔

اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب بھی
جو لوگ کافر ہیں، یہی کہتے کہ یہ تو ایک
کھلا ہوا جادو ہے"

پھر آگے چل کر اسی سورت کی ۹۱ ویں آیت میں یہی لفظ بصیغۂ جمع یعنی قراطیس کی صورت میں استعمال ہوا ہے

قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي
جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى
لِلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ
تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا"

(اے نبی) کہدے کہ کس نے اتاری تھی وہ کتاب
جو موسیٰ لایا تھا اور جو لوگوں کے لیے روشنی
اور ہدایت تھی جس کو تم صحیفے بنا کر رکھتے ہو۔
اس کے کچھ حصے تم (لوگوں پر) ظاہر کرتے ہو
اور بہت سے حصے کو چھپاتے ہو"

مندرجۂ بالا پہلی آیت میں قرطاس ورق کے معنی میں آیا ہے، جو کتابت کے لیے استعمال ہوتا تھا اور دوسری آیت میں قراطیس سے مراد وہ صحیفے ہیں جو قرطاس پر لکھے جاتے تھے، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت بلادِ عرب میں یا کم از کم حجاز میں لوگ قرطاس سے بخوبی آشنا تھے، اور یہود اپنی مذہبی کتابیں اسی قرطاس پر لکھتے تھے، البیرونی نے اس سلسلہ میں صراحت کر دی ہے کہ قراطیس سے مراد طوامیر (یعنی Rolls) ہیں، اور قرطاس کے بارے میں بھی یہ کہہ کر مزید وضاحت کر دی ہے کہ ان القرطاس معمول بمصر من لُبّ البردی۔ یعنی قرطاس مصر میں بردی کے گودے سے بنتا ہے۔ (کتاب الہند، ص ۸۰)

لفظ قرطاس کی لغوی تشریح | ابو منصور جوالیقی بغدادی نے کتاب المعرب میں اور امام جلال الدین

سیوطی نے الاتقان میں اور شہاب الدین خفاجی نے شفاء الغلیل میں قرطاس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لفظ ٹھیٹھ عربی نہیں بلکہ معرب ہے، اس کے علاوہ لسان العرب میں اس لفظ کی پانچ مختلف صورتیں لکھی ہیں، یعنی قَرطاس، قِرطاس، قُرطاس، قِرطس اور قَرطس. چنانچہ اس کے املاء اور تلفظ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ بھی اس کے غیر عربی ہونے کی ایک دلیل ہے. اگرچہ مذکورۂ بالا علماء نے قرطاس کو معرب تسلیم کیا ہے لیکن انھوں نے اسکے اصلی ماخذ پر روشنی نہیں ڈالی یعنی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے اور اسکی اصلی صورت کیا تھی.

پروفیسر زخاؤ نے جب جوالیقی کی کتاب المعرّب من الکلام الاعجمی ۱۸۶۷ء لائپزگ سے شائع کی تو انھوں نے اس پر حواشی بھی لکھے تھے، چنانچہ قرطاس کے بارے میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ یونانی لفظ (Xartes) (چارٹ) کا معرب ہے، اور اکثر علماء نے اس قول کو قبول کر لیا ہے، قرطاس کا لفظ آرامی زبان میں بھی پایا جاتا ہے، ممکن ہے کہ عربوں نے اسے آرامی کے واسطے سے لیا ہو جو ظہور اسلام کے وقت شام اور فلسطین میں بولی جاتی تھی، یا اسے براہ راست یونانی سے اخذ کیا ہو.

اس موقع پر ناظرین کرام کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عربوں نے اس سامان نوشت کے لیے جس کا ماخذ و مصدر مصر تھا، یونانی نام کیوں اختیار کیا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب اسکندر یہ اعظم نے مصر فتح کیا اور اس کی وفات کے بعد اسکے سپہ سالار بطلیموس نے وہاں اپنی حکومت قائم کی تو بہت سے یونانی اسکندریہ اور مصر کے دوسرے شہروں میں کثرت سے آباد ہو گئے، اور یونانی نے مصر میں سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت اختیار کر لی، اور ہر طرف یونانی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہو گیا، یونانیوں کے بعد جب رومیوں نے مصر پر قبضہ کیا تو ان کے عہد میں بھی یونانی زبان کا علمی اور

یونانی تسلط بدستور قائم رہا، اندریں حالات اگر عربوں نے مصری ورق کے لیے یونانی لفظ اختیار کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ بہت سے یونانی الفاظ مصر میں رواج پا چکے تھے.

مغربی علمائے لغت کی تحقیق کے مطابق Xartes سے جو متعدد الفاظ مشتق ہوئے ہیں وہ ذیل کے نقشہ سے واضح ہیں :-

یونانی Xartes (تلفظ کھارتیس)

لاطینی Charta
فرانسیسی Carte — انگریزی Chart
انگریزی Chard

آرامی :- قرطاس
عربی : قرطاس
ہسپانی Alcartuz
پرتگالی Chartaz
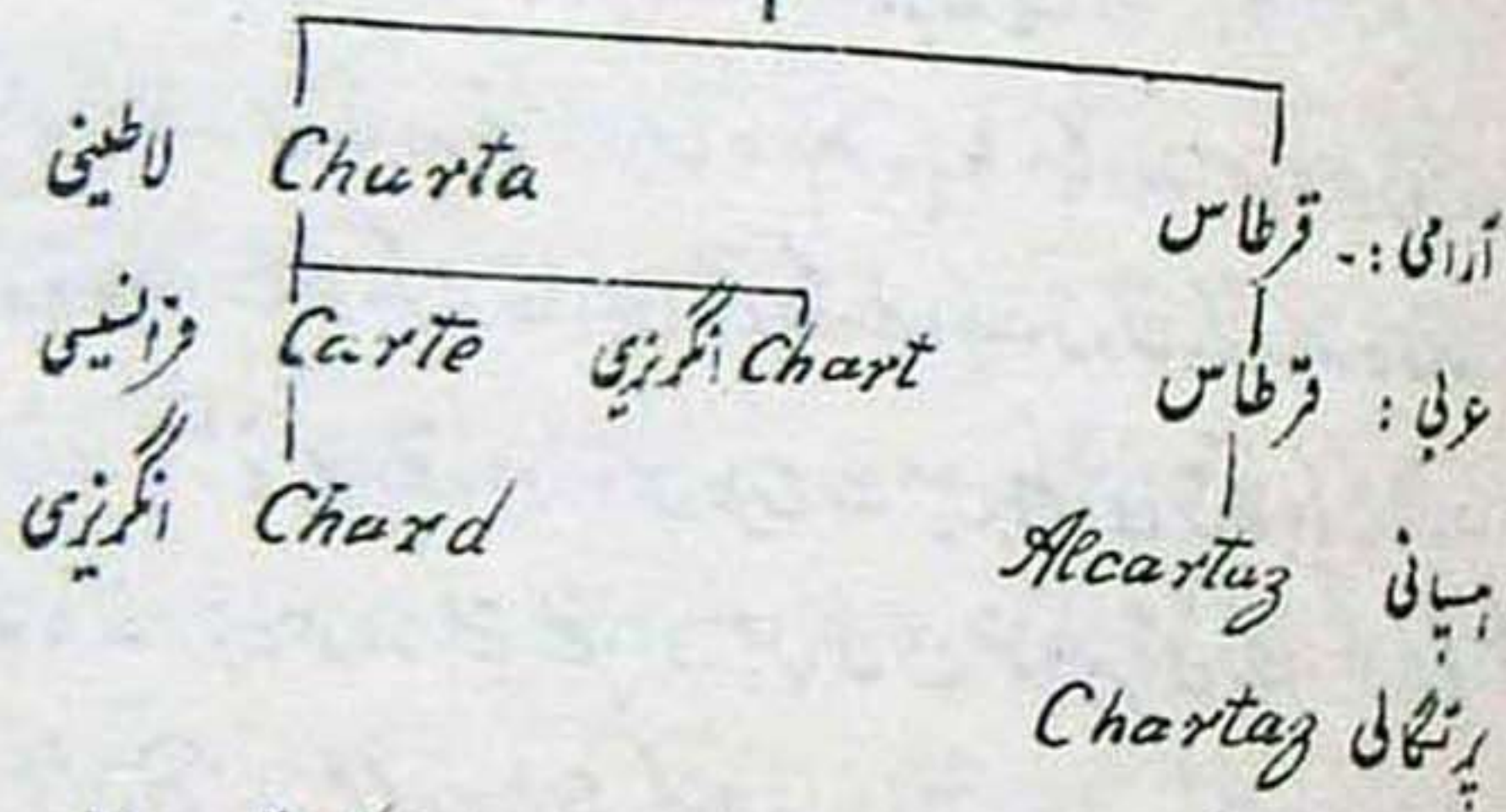
ہسپانی لفظ کی ابتدا میں جو al آیا ہے وہ عربی کا کلمۂ تعریف ال ہے، یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ لفظ اسپین کی زبان میں عربی ہی کے واسطے سے مروج ہوا ہے.

واقعۂ قرطاس

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے دوران میں واقعۂ قرطاس پیش آیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کے لیے سامان نوشت طلب فرمایا تھا. متاخرین نے اس موقع پر قرطاس کا ذکر کیا ہے، لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے اور شیخین[1] نے بھی اس سلسلہ میں محض کتاب کا لفظ استعمال کیا ہے، بہرحال اس امر میں کچھ شک

[1] جب صحابۂ کرام کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ ہیں، جب محدثین کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ہیں، اور جب فقہاء کا ذکر ہو تو شیخین سے مراد امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ ہیں.

نہیں کہ عہدِ رسالت میں عربوں کے ہاں قرطاس ایک معروف چیز تھی، جیساکہ قرآن کی مذکورۂ بالا دو آیتوں سے ثابت ہے، جن میں قرطاس کا لفظ ایک مرتبہ بصیغۂ واحد اور دوسری مرتبہ بصیغۂ جمع استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں جب ان کے ارشاد پر حضرت زیدؓ بن ثابت نے قرآن مجید کو صحیفوں کی صورت میں جمع کیا، تو وہ بھی ایک روایت کے مطابق قرطاس ہی پر لکھے گئے تھے، قلقشندی کا بیان ہے کہ ان کے لیے حریرؓ استعمال ہوا تھا، لیکن سیوطی نے اس بیان کو مستند نہیں سمجھا۔

طومار قرطاس کے ورق کا عرض عام طور پر ۹ انچ اور اس کا طول زیادہ سے زیادہ ۱۵ انچ ہوا کرتا تھا، لمبی تحریر کے لیے ایک ورق کے ساتھ دوسرا ورق گوند سے جوڑ دیتے تھے، اور اس طرح سے بیس بیس ورق کا ایک لمبا سلسلہ تیار ہو جاتا تھا، جسے طومار کہتے تھے، اور جس کی جمع طوامیر آتی ہے، طومار کو انگریزی میں Roll یا Scroll کہتے ہیں۔

طومار کو عربوں نے دَرْج یا دَرَج بھی کہا ہے (صحاح جوہری)۔ ہمارے ہاں دَرج کرنا، "اندراج پانا" یا "مندرج ہونا" کے جو کلمات مستعمل ہیں، وہ تمام اسی لفظ درج سے مشتق ہیں۔

طومار کے اندر کی تحریر عمود یعنی کالم (Column) کی صورت میں ہوتی تھی، ایک کالم کے بعد دوسرا کالم لکھا جاتا تھا، اور یہ کالم آجکل کی مروجہ کتابوں کے صفحات کے مترادف تھے، طومار کی ایک جانب لکڑی کا باریک سا بیلن جوڑ دیتے تھے، اور اس پر طومار کو لپیٹتے تھے، اس بیلن کے دونوں کناروں پر لکڑی کے دو

چھوٹے لٹو بھی لگا دیتے، تاکہ بیلن کو گھمانے اور طومار کو لپیٹنے میں آسانی ہو، قاری پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے طومار کو کھولتا اور دوسرے ہاتھ سے لپیٹتا جاتا تھا، طومار کے لیے انگریزی میں Roll کا جو لفظ آیا ہے اس میں اسی لپیٹنے کے عمل کی طرف اشارہ مضمر ہے، اسی طرح قرآن مجید کی سورۃ الانبیاء میں جہاں قیامت کے دن آسمان کے سجل کی طرح لپیٹے جانے کا ذکر آیا ہے، وہ بیان بھی طومار ہی پر صادق آتا ہے، یَوْمَ نَطْوِی السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ، یعنی جس دن ہم آسمان کو لکھے ہوئے طومار کی مانند لپیٹ لیں گے۔" ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ ہماری مروجہ کتابوں پر درست نہیں بیٹھتی، جو اوراق کی شیرازہ بندی سے بنتی ہیں اور جن کے مطالعہ کے لیے ہم کو ان کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، بلکہ یہ تشبیہ صرف طومار ہی پر صادق آتی ہے، جو لپیٹا جاتا تھا، چنانچہ علامہ زمخشری، قاضی بیضاوی اور امام خازن نے اس آیت کی تفسیر میں سجل سے طومار یا صحیفہ ہی مراد لیا ہے۔

کراسہ کبھی قرطاس کے اوراق کو اوپر تلے رکھ کر ایک پلندہ سا تیار کر لیتے، اور اس میں سے ڈوری گزار کر تمام اوراق کو یکجا کر لیتے تھے، اس قسم کے پلندے کو کراسہ کہتے تھے، کراسہ آرامی زبان کا لفظ ہے۔

صحیفہ اور مصحف محمد بن اسحٰق نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کے قبولِ اسلام کے بارے میں جو روایت بیان کی ہے اس میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ آپ کو جس وقت بتایا گیا کہ آپ کی ہمشیرہ اور بہنوئی دونوں اسلام کے حلقہ بگوش بن چکے ہیں اور آپ دریافتِ حالات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے تو اس وقت خبابؓ بن الارت ان کے ہاں موجود تھے، اور حضرت خبابؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورہ طٰہٰ مرقوم بھی

اور وہ ان دونوں کو یہ سب سورت پڑھا رہے تھے، اس سورت میں ۱۳۵ آیات ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ اتنی لمبی سورت جس صحیفہ میں مسطور ہوگی وہ کئی اوراق پر مشتمل ہوگا، اور اس کی صورت طومار ہی کی ہوگی جس کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے۔

عہد صدیقی میں قرآن مجید جمع ہوا تھا، مگر وہ الگ الگ صحف یعنی صحیفوں میں تھا، جن کی صورت غالباً طومار ہی کی تھی، حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان صحیفوں کو نقل کرا کے یکجا کر دیا اور اس مجموعہ کا نام "مصحف" ٹھہرا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے مخالفین نے اپنی بے سمجھی سے آپ پر جو الزامات لگائے تھے، ان میں سے ایک الزام یہ تھا کہ قرآن تو بیشتر الگ الگ صحیفوں میں تھا، آپ نے ان کو یکجا کیوں کر دیا۔

اگرچہ صحیفہ کا لفظ (بصیغۂ مفرد) قرآن پاک میں کہیں استعمال نہیں ہوا ہے اس کی جمع صحف کلام پاک کی متعدد سورتوں میں آٹھ مرتبہ آئی ہے۔ اور ہر موقع پر اس سے قدیم زمانے کی آسمانی کتابیں مراد ہیں، اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ صحیفہ اور مصحف دونوں لفظوں کا مادہ "صحف" ہے، جس کے معنی حمیری اور حبشی زبانوں میں بھی تحریر کرنے یا لکھنے کے ہیں، اور حبشی زبان میں تو مصحف کا لفظ کتاب کے معنی میں بہت عام ہے۔

قرطاس کے دفینے | گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں مصر میں قرطاس کے بہت دفینے دریافت ہوئے ہیں، مصر کی زمین بالعموم ریتلی ہے، اور آب و ہوا خشک، اس لیے بعض قرطاس بڑی اچھی حالت میں پائے گئے ہیں، اور اس سے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں، ابتدا میں یہ دفینے اتفاقی طور پر دریافت ہوئے تھے، لیکن جب علماء نے ان کا بغور مطالعہ کیا اور انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان سے قدیم زمانے کے

متعلق ہر قسم کی قیمتی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں تو قراطیس کی تلاش منظم طریقہ سے ہونے لگی، اور بیرونی ملکوں کے علماء کی جماعتیں ان کی دریافت کے لیے وقتاً فوقتاً مصر میں وارد ہونے لگیں، چنانچہ منفس، ثیبہ، فیئوم، ادفو اور بہنسا وغیرہ مقامات سے بہت سے دفینے ملے، اور ان سے ہزاروں کی تعداد میں قرطاس حاصل ہوئے جو مصر، یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں گئے ہیں، اور علماء کے زیر مطالعہ ہیں،

قراطیس کے مطالعہ نے علمی دنیا میں اب ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جس کو انگریزی میں Papyrology اور جرمن زبان میں Papyrusforschung کہتے ہیں، بعض علماء نے اس فن میں تخصص حاصل کیا ہے، اور ان کی تحقیقات کے نتائج مقالات کی صورت میں ایسے رسائل اور جرائد میں شائع ہو رہے ہیں جو اس موضوع کے ساتھ مخصوص ہیں۔

جو قرطاس مصر سے دستیاب ہوئے ہیں، ان کا تعلق وہاں کی تاریخ کے مختلف زمانوں سے ہے، بعض قدیم مصری زبان میں ہیں، بعض یونانی اور بعض عربی زبان میں ہیں، اور ان کے ذریعہ سے ہر دور کے متعلق ہماری معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مثلاً

قدیم مصری زبان کا ایک شاندار طومار دستیاب ہوا ہے، جو قرطاس پر لکھا ہوا ہے اور جس کا زمانہ تخمیناً سترہویں صدی قبل مسیح ہے، اس طومار میں فن جراحی کا ایک مکمل رسالہ مرقوم ہے، جو سائنس کی تاریخ کے متعلق غالباً سب سے زیادہ قدیم دستاویز ہے، اس طومار سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں نے جراحی میں اس درجہ ترقی کر لی تھی، جس سے اس فن پر مستقل رسالہ کے لکھنے کا امکان پیدا ہوا،

اکثر علماء کا خیال ہے کہ علمِ طب کی ابتدا مصر ہی سے ہوئی تھی، اس طومار کی دریافت
سے جس کا موضوع علم جراحی ہے، اس نظریہ کی قوی تائید ہوتی ہے. اس طومار کو مسٹر
ایڈون اسمتھ نے دریافت کیا تھا، اس لیے یہ اسی کے نام سے موسوم ہے، اور آج کل
نیویارک کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے ہاں محفوظ ہے، اور ادارے آثار قدیمہ کے
مشہور ماہر پروفیسر جیمز ہنری بریسٹڈ نے ترجمہ اور حواشی کے ساتھ شکاگو سے شائع
کر دیا ہے۔

اسی طرح یونانی زبان کے جو قرطاس مصر سے دستیاب ہوئے ہیں اُن میں ایک
مشہور یونانی ادیبوں، شاعروں اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف پائی گئی ہیں،
اور ان میں بعض ایسی تالیفات بھی شامل ہیں جو خود یونان میں ناپید ہو چکی تھیں،
مثلاً یہ بات تو علماء کو بخوبی معلوم تھی کہ ارسطو نے شہر اثینہ (Athens) کے آئین
و دستور پر ایک کتاب لکھی تھی، لیکن وہ مدت دراز سے آفات زمانہ کی نذر ہو چکی
تھی، لیکن اچانک ۱۸۹۰ء میں علمی دنیا یہ خبر سن کر دنگ رہ گئی کہ ارسطو کی یہ گمشدہ
تالیف مصر میں قرطاسوں پر لکھی ہوئی مل گئی ہے، اب یہ نادر قرطاس برٹش میوزیم میں
محفوظ ہیں، اسی طرح یونانی زبان کے قراطیس میں "کلماتِ سیدنا عیسیٰ" (Logia
of ove Lord) بھی دستیاب ہوئے ہیں جو مذہبی تاریخ کے لحاظ سے بیحد دلچسپ
اور اہم ہیں، کیونکہ ان میں حضرت عیسیٰ کے بعض ایسے کلمات اور ملفوظات بھی
پائے گئے ہیں جو مروجہ اناجیل میں مذکور نہیں ہیں،[۱]

عربی زبان کے قراطیس
عربی زبان کے قرطاسوں کا علمی مطالعہ سب سے پہلے فرانس کے مشہور

[۱] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ذیل "Logia".

مستشرق سلوستر دساسی (Sibestre de Sacy) متوفی ۱۸۳۸ء
نے شروع کیا. جو قرطاس اس نے شائع کیے وہ ۱۸۲۵ء میں سقارہ کے قریب
دیرابوہرمیں سے ملے تھے. اس کے بعد آسٹریا کے شاہی کتبخانہ کے خازن فان
زہ باشق (Von Karabaçek) متوفی ۱۹۱۸ء نے اس موضوع پر خاص
توجہ مبذول کی اور ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان عربی قرطاس اور
کاغذ کے متعلق بہت سے تحقیقی مقالات جرمن زبان میں لکھے،
ایک جرمن کاؤنٹ رائن ہارٹ نے مصر میں بہت سے عربی قرطاس
جمع کیے تھے، ان کو بعد ازاں شاٹ نے ہائڈل برگ (جرمنی) کی یونیورسٹی
لائبریری میں وقف کر دیا، یہ مجموعہ اب Schott-Reinhardt
کے نام سے مشہور ہے، جس میں بارہ سو (۱۲۰۰) کے قریب قرطاس ہیں۔ اکثر عربی زبان میں
ہیں، مگر بعض میں یونانی تحریریں بھی ملتی ہیں، پروفیسر بیکر (C. H. Becker)
نے اس مجموعہ کا بڑے غور سے مطالعہ کیا، اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو ۱۹۰۶ء
میں ہائڈل برگ سے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا اور اس میں بعض قرطاسوں
کی عکسی نقلیں بھی شامل کیں۔ ان میں بعض قرطاس قرہ بن شریک والیِ مصر کے
زمانے کے ہیں، جس نے خلیفہ ولید بن عبد الملک اموی کے عہد میں مصر پر ۹۰ھ
سے لیکر ۹۶ھ تک حکومت کی تھی، ذیل میں دو قرطاسوں کی عبارت منقول ہے جن میں
چند مقامات کے خراج کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا كتاب من قرة بن شريك الى اهل سيواجيا من كورة

اشقوہ انه اصابکم من جزیة سنة ثمان وثمانین دینار اوسدس دینار
عدداو کتب راشد فی صفر من سنة احدی وتسعین ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ھذا کتاب من قرہ بن شریک لاھل سیو البسیر ومن کورہ
اشقوہ انه اصابکم من جزیة سنة ثمان وثمانین مأة دینار
واربعة دینار وثلث دینار عددا ومن ضریبة الطعام احد
عشر اردب قمح وثلث اردب وکتب راشد فی صفر من سنة
احدی وتسعین ۔

مصر میں جو عربی قرطاس دستیاب ہوئے ہیں ان میں سرکاری کاغذات اور نجی مراسلات کے علاوہ کچھ ایسا مواد بھی ملا ہے جس کا تعلق طب، شعر و شاعری اور حدیث نبوی کے ساتھ ہے۔ آجتک اس قسم کا جو ذخیرہ دریافت ہوا ہے اس میں غالباً سب سے زیادہ اہم ۲۷ اوراق کا وہ صحیفہ ہے جس میں ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم قرشی مصری متوفی ۱۹۷ھ کی کتاب الجامع فی الحدیث مرقوم ہے، یہ صحیفہ ادفو کے مقام سے ملا تھا اور اب قاہرہ کے قومی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

انگلستان کے عربی قراطیس عربی قراطیس کے چند مجموعے انگلستان میں بھی موجود ہیں، مثلاً کچھ عربی قرطاس لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں، اگرچہ اب تک ان میں سے بہت کم دائرۂ تحقیق یا معرض اشاعت میں آئے ہیں، عربی قرطاسوں کا ایک بڑا مجموعہ اوکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں بھی محفوظ ہے جس کی فہرست پروفیسر مارگولیتھ نے ۱۸۹۳ء میں شائع کر دی تھی، اسی قسم کا ایک ذخیرہ مانچسٹر کی جان ریلا نڈز لائبریری (J. Rylands Library) میں بھی موجود ہے، پروفیسر ممدوح اس ذخیرہ کا بھی کئی سال تک مطالعہ

کرتے رہے اور انھوں نے آخر کار ۱۹۳۳ء میں اس کی مفصل فہرست شائع کی جس میں چالیس قراطیس کی عکسی نقول بھی شامل تھیں، پروفیسر موصوف کو عربی زبان پر جو غیر معمولی عبور حاصل تھا، اور ان کی طبیعت میں جو مشکل پسندی تھی، ان کی بدولت وہ عربی قراطیس کے مطالعہ میں خوب کامیاب رہے اور اس میدان تحقیق میں انکی مساعی خوب بار آور ہوئیں، انگلستان میں عربی قراطیس کے متعلق آجتک جقدر تحقیقی کام ہوا ہے وہ بیشتر پروفیسر مارگولیتھ ہی کے علمی تبحر کا رہین منت ہے، وفات (۱۹۴۰ء) کے بعد انگلستان میں مجھے ایسا کوئی مرد میدان نظر نہیں آتا جو اس سنگلاخ میدان کی مشکلات کا حریف بن سکے۔

انگلستان کے مذکورۂ بالا علمی مرکزوں کے علاوہ عربی قرطاسوں کے وافر ذخیرے قاہرہ، پیرس، برلن، ویانا اور سٹراسبورگ میں بھی موجود ہیں،

پراہا (Prague) یونیورسٹی کے پروفیسر اڈولف گرومان (Grohmann)[1] ایک مدت دراز سے عربی قرطاسوں کا بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مطالعہ کر رہے ہیں اور آج کل اس موضوع پر سند مانے جاتے ہیں، متفرق مقالات کے علاوہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں اس مضمون پر جرمن زبان میں ایک جامع کتاب لکھی تھی اور عربی قراطیس کے متعلق اس وقت تک جو معلومات حاصل ہو چکی تھیں، ان کو قرینہ کے ساتھ یکجا جمع کر دیا تھا، پھر اسی کتاب کو انھوں نے عربی کا جامہ پہنایا اور اس کا نام اوراق البردی باللغة العربیة رکھا، قاہرہ کے قومی کتب خانہ میں جو عربی قرطاس محفوظ ہیں، پروفیسر موصوف نے ان کو بھی کئی جلدوں میں شائع کر دیا ہے[1]۔

---

[1] Adolf Grohmann:-
(1) Allgemeine Eimfuhrang in die arabischen Papyri Wien 1924
(2)
(2) From the world of Arabic Papyri 1952
(3) Arabic Papyri in the Egyptian Library Vols. 1934-1955

عربی قراطیس کا مطالعہ امریکہ میں

اس موضوع کی دشواری کے باوجود عربی قراطیس کے متعلق امریکہ میں بھی تحقیقی کام شروع ہوچکا ہے، جس کے لیے ہم ایک عربی الاصل خاتون نبیہہ عبود (Nabiha Abbott) کے ممنون ہیں، محترمہ شکاگو یونیورسٹی میں اسلامیات کی تعلیم دیتی ہیں، اور اس کے علاوہ وہاں کے اوری انٹل انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ بھی منسلک ہیں، جو مشرقی ملکوں کے آثار قدیمہ کی تحقیق میں عالمگیر شہرت رکھتا ہے، کچھ عرصہ سے موصوف نے عربی قرطاسوں کا مطالعہ شروع کر رکھا ہے، اور اپنے مجوزہ سلسلہ کی دو جلدیں شائع کرچکی ہیں، جن کی تدوین و ترتیب مضامین کے لحاظ سے ہوگی، پہلی جلد (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) میں ایسے قرطاسوں کا مطالعہ کیا گیا ہے، جن کی نوعیت تاریخی ہے، چنانچہ اس ضمن میں آٹھ عرب مورخین زیر بحث آئے ہیں، جن کا زمانہ آٹھویں صدی سے لیکر دسویں صدی عیسوی تک ممتد ہے۔ اس جلد میں ۱۳ قرطاسوں کی عکسی نقول بھی مندرج ہیں، دوسری جلد میں جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، ایسے قراطیس سے بحث کی گئی ہے جو علم تفسیر اور حدیث سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے مندرجات مروجہ تفاسیر اور سنن سے بھی قدیم تر ہیں، اس جلد کی ضخامت تین سو صفحات سے زیادہ ہے، اور اس میں عکسی نقول کی ۳۷ پلیٹیں بھی شامل ہیں۔[ل]

ل Nabiha Abbott: Studies in Arabic Papyri

Vol. I: Hestorical Documents. 1956

Vol. II: Tafsir and Tradition. 1967

Published by The Oriental Institute University of Chicago.

اس تفصیل سے میرا مقصود یہ ہے کہ ناظرین کرام کو اس امر کا کسی قدر اندازہ دلایا جائے کہ عربی قراطیس کا مطالعہ کس قدر اہم ہے، اور بلاد مغرب میں وہ کس حد تک ترقی کرچکا ہے، لیکن اپنا یہ حال ہے کہ ابنائے وطن کو ابھی تک یہ سمجھانا ضروری ہے کہ قرطاس کی اصلیت اور کیفیت کیا ہے، اور ان کو ابھی اس بات سے مطلع کرنا باقی ہے کہ دنیا کے کئی علمی مرکزوں میں عربی قراطیس کے کثیر ذخیرے موجود ہیں اور وہ بیش قیمت علمی اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہیں، اور اس اعتبار سے مطالعہ اور استفادہ کے لائق ہیں۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

قرطاس کی علمی اور تمدنی اہمیت

عہد قدیم کے مہذب اور متمدن ملکوں میں قرطاس کو اپنے رواج عام کی بنا پر وہی اہمیت اور قدر و منزلت حاصل رہی ہے جو آجکل کاغذ کو حاصل ہے، ہزاروں سال تک نہ صرف خود اہل مصر قرطاس پر لکھتے رہے، بلکہ یہودیوں کی مذہبی کتابیں بھی اسی پر لکھی گئیں، یونانیوں نے بھی اپنا فلسفہ و حکمت اسی قرطاس میں قلمبند کیا، رومیوں کے لیے بھی اس کا استعمال ناگزیر ٹھہرا، غرضکہ قدیم زمانے میں زندگی کی عام ضروریات کی کفالت کے علاوہ علوم و فنون کی حفاظت و اشاعت میں قرطاس نے وہی کام دیا ہے جو فی زمانا کاغذ سرانجام دے رہا ہے، لہذا عہد قدیم کی حضارت قرطاس کی اسی طرح رہون منت رہی ہے جس طرح آج کل کا تمدن کاغذ کا ممنون احسان ہے۔

(باقی)

مکتوبِ امریکہ

جناب پروفیسر حفیظ ملک شعبۂ سیاسیات ولینووا یونیورسٹی (امریکہ)

"اس خط میں بعض مفید باتیں ہیں، اس لئے ناظرین کی دلچسپی کے لئے اُس کو شائع کیا جاتا ہے"

۲۵ راگست ۱۹۷۰ء

مکرمی سیّد صاحب!   مئی اور جون کے شماروں میں آپ کا مضمون "پاکستان میں دو مہینے" پڑھا، جی یہ چاہتا تھا کہ مضمون ختم نہ ہو، آپ نے کیا کیا گل افشانی کی ہے، بہت ہی لطف اندوز ہوا،

جون کے شمارے میں آپ نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا ایک اقتباس درج کیا ہے، (8 - 427) آج سے چند سال پہلے جب ڈاکٹر صاحب میرے یہاں مہمان ہوئے تھے، تو میں نے اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کی تھی حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے "مسٹر بیک" پر قطعی کوئی تحقیق نہیں کی تھی، بلکہ مولانا بنگلوری نے جو کچھ "روشن مستقبل" میں لکھا تھا، اوس کو دہرا دیا ہے، اور اس میں زیادہ ذمہ داری سے کام نہیں لیا، اس میں مصلحت اندیشی زیادہ نظر آتی ہے، اس سلسلہ میں میں نے ایک مضمون سرسیّد پر لکھا تھا، جو حال میں لندن سے شائع ہوا ہے، جس میں

میں نے اپنے محترم دوست ڈاکٹر عابد حسین پر تنقید بھی کی ہے، اور اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، کہ انھوں نے کوئی ذاتی تحقیق "مسٹر بیک" پر نہیں کی،

دہلی میں بدر الدین طیب جی کے جو کاغذات موجود ہیں اُن کی ایک کاپی حال ہی میں مجھے وصول ہوئی ہے، ان کاغذات میں بیک صاحب کے بھی چند خطوط ہیں، جو انھوں نے طیب جی کو لکھے تھے، ان خطوط سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نظریاتی قیادت سرسیّد کی تھی، بیک محض ایک وفادار سکریٹری کی حیثیت سے سرسیّد کی قیادت پر عمل کرتے تھے، میں ان دنوں جو کتاب سرسیّد پر لکھ رہا ہوں، اس میں ان مسائل کا ذکر آئے گا، اس خط میں اپنے مضمون کا (Off Print) بھیج رہا ہوں، اپنے خیالات اور رائے سے آگاہ فرمائیے گا،

میری آپ سے ملاقات آج تک نہیں ہوئی، لیکن میں آپ کا مدّاح اور خوشہ چیں ہوں، آپ علمی معاملات میں میری جو رہنمائی فرماتے رہتے ہیں، میں اس کے لئے آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ایک دن اعظم گڈھ میں حاضر ہو کر نیاز حاصل کروں گا،

ایک مرتبہ شیخ اکرام صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ سرسیّد کی تحریک کے خلاف رجعت پسندی کی قیادت مولانا شبلی نے کی تھی، میں ان دونوں کے اختلافات کی نوعیت کو سمجھتا ہوں، اور مولانا شبلی کو ہرگز رجعت پسند خیال نہیں کرتا، ایک حد تک (Conservatism) مولانا شبلی میں ضرور موجود ہے، لیکن حالات اور واقعات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے، تو یہ کوئی عیب نہیں ہے، سرسیّد آخری سالوں میں لبرلزم میں انتہا پسند ہو گئے تھے، اس لئے مولانا شبلی کی تحریک گویا ایک

Corrective کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام کو سمجھنے کے لئے میں شبلی، سید سلیمان ندوی، اقبال اور سرسید سے استفادہ
کرتا ہوں، Balanced understanding کے لئے شبلی اور
سرسید لازم و ملزوم ہیں، وجہ یہ ہے کہ اکثر فقہی مسائل کے سمجھنے کے لئے خود
علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

آپ ایسے بزرگوں کا دم غنیمت ہے، اور ہم ایسے لوگوں کے لئے باعث فخر
آپ نے جو باتیں میرے متعلق لکھی ہیں وہ آپ کے اخلاص اور محبت کی وجہ سے
ہیں، ورنہ "من آنم کہ من دانم" میں گذشتہ ۱۷ برس سے امریکہ میں مقیم ہوں، اسلام بالخصوص
ہند و پاکستان کے اسلامی تمدن سے میری لگن کی ابتدا یہیں سے ہوئی آج سے چودہ ۱۴ برس پہلے
جب میں اپنی پہلی کتاب کے لئے مواد کی فراہمی اور تحقیق میں مصروف تھا تو
واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس میں میرے شب و روز گزرتے تھے، بارہ یا چودہ
گھنٹے روزانہ مطالعہ کا میرا معمول تھا، تاریخ کی سیکڑوں کتابیں نظر سے گذریں، فلسفہ اور
عمرانیات کو پڑھا، اسلام کا مطالعہ بھی کیا، لیکن لگن اس وقت شروع ہوئی جب میں نے
شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس سے اسلام کے متعلق جو کج فہمی تھی وہ
دور ہونے لگی، ذہنی تسکین کے علاوہ قلبی سکون میسر آنے لگا گویا اب دوبارہ مسلمان ہوا لیکن
اب اسلام پر ایمان محض روایتی اور موروثی نہیں تھا، بلکہ اس کی تصدیق دل بھی کرتا تھا
اور دماغ بھی، پھر منزل صاف نظر آنے لگی، اور میں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ زندگی کا
ثمرہ ہی ہوگا، جس کی طرف آپ نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

مغربی زندگی سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ اہل مغرب محنت کے عادی ہیں،

مغربی زندگی محض تعیش کی زندگی نہیں ہے، دور سے دیکھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہاں
کے لوگ صرف زندگی سے لطف اندوز ہونا ہی جانتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں
کے عوام اور خواص کی زندگی محنت اور مشقت کی زندگی ہے، لیکن مغربی تہذیب اس
بات کی اجازت بھی دیتی ہے کہ کھانے کے بعد شیرینی کا ذائقہ بھی چکھا جائے، اہل
مشرق اسی چیز کو عیش اور لطف اندوزی کہتے ہیں، عیش اور لطف اندوزی گا فرق راہ
نجات کے لئے محض سستانے کا نام ہے، اسی عمرانی اور تاریخی نظریہ کو علامہ اقبال نے
اس طرح بھی بیان کیا ہے؛

ع: شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

ہمارے نوجوان جب مغرب میں آتے ہیں تو "لطف اندوزی" کے پہلو سے بہت زیادہ
متاثر ہوتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے تمدن میں "لطف اندوزی" کا نظریہ اور اس کی
روایت موجود نہیں ہے، جب میں یہاں آیا تھا تو میری عمر ۲۴ سال کی تھی، اور اب
چالیس کے پیٹے میں آرہی ہے، ابتدا میں لطف اندوزی کے پہلو سے بھی آشنا ہوا،
مگر پھر اس کی حقیقت کو سمجھ گیا، اس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں، لیکن میں نے
اکثر نوجوانوں کو دیکھا ہے، وہ لطف اندوزی ہی کو حاصل زیست سمجھ کر واپس
چلے جاتے ہیں، اور ان کی زندگی بے کار ہو کر رہ جاتی ہے، یہی المیہ سید محمود کا
تھا، اور یہی المیہ نواب وقار الملک کے صاحبزادے محمد احمد کا تھا، کہ عین جوانی
میں مر گئے، انھوں نے شراب نوشی تو سیکھی لیکن اعتدال اختیار نہ کرسکے، اب بھی
بعض اوقات ایسے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن میرے تجربہ میں اب ہندوستانی
اور پاکستانی نوجوان طلبہ کی اکثریت بے راہ روی اختیار نہیں کرتی، اب سیاسی اور

تمدنی شعور کی حالت دوسری ہے،

اس خط میں علامہ اقبال کے متعلق ایک مضمون کی کاپی ارسال کر رہا ہوں، اپنی رائے سے مطلع فرمایئے گا، میں اس ہفتہ میں مسلم ورلڈ کو آپ کی طرف سے دو سالوں کا چندہ (8 ڈالر) بھیج دوں گا، وہ آپ کو اس کی اطلاع دیں گے، خط و کتابت میں وہ لوگ کچھ سست رفتار معلوم ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں اسٹاف معقول تعداد میں نہیں ہے،

والسلام

المخلص: حفیظ ملک

ہندوستان کے سلاطین، علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

(طبع دوم)

ہندوستان میں مسلمان فرمانرواؤں کا عہد ۱۳ ویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر ۱۹ ویں صدی کے وسط تک ختم ہو جاتا ہے، اس مدت میں مختلف مذاق و طبیعت کے تقریباً ۸۰ بادشاہ ہوئے، اس مختصر کتاب میں انہی سلاطین اور فرمانرواؤں کے وقت کے علماء و مشائخ سے تعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس سے ضمناً اس پورے دور کی مذہبی ذہنی اور فکری تاریخ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں بالکل منفرد ہے،

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم۔اے

ضخامت: ۲۲۸ صفحے قیمت: ۵ روپیے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

فتاوی رحیمیہ، جلد دوم، افادہ، مولانا حافظ قاری مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری، بڑی تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۳۲ مجلد قیمت عہ۔ و غیر مجلد عہ، پتہ۔ عطرستان چوک بازار، سورت (گجرات)

اس مجموعہ فتاوی کی پہلی جلد کا ان صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے، زیر نظر جلد میں کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب الاضحیہ، کتاب الذبائح، کتاب النکاح، کتاب الطلاق (بشمول رضاعت، عدت و حضانت) کتاب المساجد و کتاب الوقف، کتاب البیوع والربا، کتاب الحظر والاباحہ، کتاب الرویا، کتاب الوصیۃ والمیراث، رد بدعات اور کتاب المتفرقات کے زیر عنوان مختلف النوع استفسارات کے محققانہ اور تشفی بخش جواب دیئے گئے ہیں، بعض احکام کے مصالح اور حکمتیں بھی بیان کی گئی ہیں، اور بعض نئے پیش آمدہ مسائل کا بھی ذکر ہے، بدعات کے سلسلہ میں بعض اکابر علمائے بریلی کے فتوے نقل کر کے ان کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کی طرح اس میں بھی ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے، اور حوالے میں کتب فقہ کے ساتھ کلام مجید احادیث نبوی اور صحابہ کرام کے تعامل کو التزام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، مگر دوسرے طبقوں کے مسلک کی تردید میں غیر ضروری طوالت لہجہ میں تلخی اور مناظرانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ نہایت مفید و متنوع مسائل پر مشتمل اور عام مسلمانوں، علماء اور ارباب افتاء سب کے مطالعہ کے لائق ہے،

فارسی ادب بعہد اورنگ زیب، مرتبہ جناب ڈاکٹر نور الحسن صاحب انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۰۰، مجلد مع گردپوش قیمت عہ، ناشر اندوپرشین

سوسائٹی، دھلی۔

ہندوستان کے تیموری فرمانرواؤں کی رزمیہ داستانوں سے قدیم تاریخیں بھری ہوئی ہیں لیکن
ان کی بزم آرائی کے تذکرے کم لکھے گئے ہیں، دارالمصنفین نے ان کی تمدنی و سیاسی تاریخ کی طرح انکی
علم پروری و ادب نوازی کی جانب بھی توجہ کی جس کا مرقع بزم تیموریہ ہے، مذکورۂ بالا کتاب لائق مصنف کا
تحقیقی مقالہ ہے جس پر دلی یونیورسٹی سے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے، اس میں اورنگ زیب عالمگیر
کے عہد کے ادب و شاعری کا جسکو مغلوں کے زوال کا عہد سمجھا جاتا ہے، مفصل اور محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، یہ
تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے تین ابواب میں عالمگیر کے دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات اور
اس عہد کی شاعری کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے پھر دو ابواب میں معروف و غیر معروف مثنوی نگار اور
غزل گو شاعروں کا تذکرہ اور ان کے کمالات اور تصنیفات پر تبصرہ کیا گیا ہے، بقیہ ابواب میں
فارسی نثر کا عمومی جائزہ، مکاتیب و انشاء، داستان و قصص، ترجمے، موسیقی، تاریخ و سوانح، تصوف
و اخلاق، لغت و فرہنگ اور شرح وغیرہ سے متعلق تصانیف کا ذکر اور ان پر تبصرہ ہے لیکن یہ تعجب ہے
کہ شعر و سخن سے اورنگ زیب کی دلچسپی کا کوئی ذکر نہیں ہے، مذہبی کتابوں کا متفرقات میں نہایت سرسری
ذکر کیا گیا ہے، غنی کے دیوان کی ترتیب کے سلسلہ میں امین دراب کے مرتبہ دیوان کا جس کو حال ہی میں
علی جواد زیدی صاحب نے اضافے کے ساتھ از سر نو کشمیر سے شائع کیا ہے کوئی
ذکر نہیں ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب تلاش اور محنت سے لکھی گئی ہے، مواد و معلومات کی فراہمی
میں بڑی چھان بین سے کام لیا گیا ہے، مصنف ابھی نوجوان ہیں لیکن تحریر میں پختگی، بیان میں شائستگی
تبصروں میں توازن اور حسن مذاق نمایاں ہے، یہ کتاب فارسی ادبیات سے دلچسپی رکھنے والوں
کے مطالعہ کے لائق ہے،

مصلحین امت ، مترجمہ شیخ نذیر حسین صاحب ایم۔ اے۔ بڑی تقطیع کاغذ و کتابت و

طباعت غنیمت صفحات ۲۵۵ قیمت ے، پتہ مکتبہ علمیہ لیک روڈ۔ لاہور،

ڈاکٹر احمد امین مرحوم مصر کے مشہور فاضل و مصنف تھے، انھوں نے مسلمانوں کی علمی و مذہبی
اور ذہنی و اجتماعی تاریخ پر کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب ان کی مشہور تصنیف زعماء الاصلاح
فی العصر الحدیث کا اردو ترجمہ ہے، اس میں عالم اسلام کی دس ممتاز شخصیتوں محمد بن عبدالوہاب،
مدحت پاشا، سید جمال الدین افغانی، سر سید احمد خان، سید امیر علی، خیرالدین پاشا تونسی، علی مبارک
پاشا، عبداللہ ندیم، سید عبدالرحمٰن کواکبی، اور شیخ محمد عبدہٗ کے اصلاحی و تعلیمی کارناموں، اجتماعی
و سماجی خدمات، ملی و قومی کاموں اور سیاسی و انقلابی جد و جہد کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے ان کے
اصلاحی و انقلابی خیالات اور مختلف النوع کارناموں کے علاوہ ان کے مختصر حالات، عقائد و افکار
اور ان کے عہد و ماحول کے عام سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات و رجحانات اور بعض اسلامی
ملکوں کے اصلاحی و سماجی تحریکوں کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، لیکن جیسا کہ خود
فاضل مترجم نے لکھا ہے مصنف کو اردو زبان سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہندوستان کی عظیم
شخصیتوں اور نامور رہنماؤں کا علم نہ ہو سکا اور انھوں نے سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کے
متعلق انگریزی کتابوں سے حاصل شدہ معلومات پر اکتفا کیا ہے، اس لئے انکا حق ادا نہیں ہو سکا ہے،
کتابت و طباعت کی غلطیاں بہت ہیں، اس کتاب کا نام "مصلحین امت" بھی کھٹکتا ہے، اس میں
جن لوگوں کا ذکر ہے انھوں نے اپنے اپنے دائروں میں بلاشبہہ مفید اصلاحی کام انجام دئے ہیں،
لیکن ان میں سے اکثر پر مصلحین امت کے اصطلاحی لفظ کا اطلاق مشکل سے کیا جا سکتا ہے،

محمد علی جناح ، مترجمہ جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت
و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸، مجلد مع گرد پوش قیمت ۲/۵۰ ہے، پتہ:- علی مجلس دلی ۶
کانجی دوارکا داس نے جو ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کی تحریکوں میں شریک اور

اس کے عینی شاہد ہیں، جنگ آزادی کے متعلق دو کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں، جو ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۶ء ۱۹۴۷ء کے واقعات اور سیاسی کوائف پر مشتمل ہیں، ان میں متحدہ ہندوستان کے ان عظیم رہنماؤں کا بھی مفصل ذکر ہے، جن کا ملک کی آزادی اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں نمایاں حصہ رہا ہے، جناب سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق بمبئی نے دونوں کتابوں کے وہ حصے جن کا بانی پاکستان محمد علی جناح سے تعلق ہے سلیقہ سے مرتب کرکے سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب قائد اعظم کے ابتدائی خانگی واقعات اور ان کی رومانی شادی سے شروع اور ملک کی تقسیم کی داستان پر ختم ہوتی ہے اس میں اُن کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے اہم حالات، نجی زندگی کے بعض دلکش پہلو، اُن کی قد آور شخصیت کے مختلف النوع جلوے، بے داغ کردار کے بلند نمونے، ہندو مسلمان دونوں میں انکی مقبولیت وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے مسٹر جناح کی قوم پروری کا خصوصیت سے تذکرہ کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ حقیقۃً وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے، انھوں نے پاکستان کی بازی نہیں جیتی، بلکہ کانگریسی لیڈر نہرو اور پٹیل بازی ہار گئے، پاکستان کے قیام کی ذمہ داری عموماً تمام مسلمانوں اور مسٹر جناح پر ڈالی جاتی ہے لیکن خود ہندو مفکرین و مورخین کی نظر اس کے دوسرے پہلو پر بھی پڑنے لگی ہے، چنانچہ مصنف کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں تاہم بہت سے لوگوں کو اب بھی اس سے اختلاف ہوگا لیکن مصنف مسٹر جناح کے خاص دوستوں میں ہیں، برسوں اُن کے ساتھ کام کر چکے ہیں، اُن کی زندگی کے سارے نشیب و فراز اور جنگ آزادی کے ہر مرحلہ سے پوری طرح واقف ہیں، اس لئے مسٹر جناح کے بارہ میں اُن کی رائے بڑی وقیع ہے، اس کے علاوہ انھوں نے یہ سب کچھ اپنی تحریری یادداشتوں کی روشنی میں لکھا ہے، اسلئے اسکی حیثیت مستند تاریخی دستاویز کی ہوگئی، یہ کتاب تنہا مسٹر جناح کی داستان حیات نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی گذشتہ نصف صدی کی سیاسی سرگذشت بھی ہے، اور اس سے جنگ آزادی کی پوری تاریخ اور اس کے لیڈروں کے خدمات کی تفصیل بھی سامنے آجاتی ہے، اس کے ترجمے سے اردو کے ذخیرہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۶ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

.......ہ.......